بس ایک بات خاص تھی اس گھر میں۔ درخت بہت سے تھے اس میں ورنہ ۔ ورنہ تو ۴۰۰،۹۰ کا بنا ہوا مکان ۔ ایک ڈیڑھ کمروں میں کوٹھیاں تک موجود تھیں ۔ جتنی چاہے چن لو۔

لاؤنج ظاہر ہے کہ نہیں تھا ۔ البتہ برآمدہ ضرور تھا۔ جس کے تین طرف جو تھے گئے تھے۔ اور سامنے باغ سا تھا۔ باغ میں درخت تھے ۔ پیپل کے ، سفیدے کے ، ہر قسم کے درخت ۔ شہتوت کا درخت بھی تھا ۔ بیرونی کھڑکی کے سامنے ۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا ۔ تقسیم سے پہلے شاید اسے پھیرے لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ۔ اب تو خیر صرف کوکلا چھپاکی، جمعرات ، یا پانگ بارسل کھیلنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔

شمالی جانب والے کمروں میں تین سیڑھیاں اتر کر باورچی خانہ موجود تھا ۔ برابر میں غسل خانہ ۔ سامنے آنگن اور آنگن کے اطراف میں نی ہوئی کیاریاں ، جن میں نیم کے دو انتہائی قدیم درخت تھے۔

پھر ان سب کو محیط کرتی ہوئی دیوار ۔ کل نقشے میں غالباً صرف یہی ایک چیز تھی ، جو زمانہ قدیم سے تعلق رکھتی تھی ۔ اور بعینہ طور پر اسی لیے انتہائی نازک بنیادوں پر قائم تھی۔

اس دیوار کے ہونے نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا ۔ اونچائی اتنی ہی تھی کہ کوئی بھی تھوڑی سی تکلیف جھیل کر اندر آسکتا تھا ۔ لیکن پھر بھی جب

فوزیہ حسین

بہاروں سے پہلے

Famous Urdu Novels

مکمل ناول

Free pdf Library

بس ایک بات خاص تھی اُس گھر میں ۔
درخت بہت سے تھے اُس میں ورنہ ۔ ورنہ تو
۱۹۴۰ء کا بنا ہوا مکان ۔ ایک دو کمروں میں تو کڑیاں
تک موجود تھیں ۔ جتنی چاہے گن لو ۔
لاؤنج ظاہر ہے کہ نہیں تھا ۔ البتہ برآمدہ ضرور تھا ۔
جس کے تینوں طرف جوڑی دار کمرے تھے ، اور سامنے باغ
سا تھا ۔ باغ میں درخت تھے ۔ پیپل کے ، سفیدے
کے ، قسم قسم کے درخت ۔ شہتوت کا درخت بھی تھا ۔
بیرونی کھڑکی کے سامنے ۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک
چبوترہ سا بنا ہوا تھا ۔ تقسیم سے پہلے شاید اُسے پھیرے
لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ۔ اب تو خیر صرف
کوکلا چھپاکی جمعرات ، یا پاسنگ پارسل کھیلنے کے لیے
استعمال کیا جا سکتا تھا ۔
شمالی جانب والے کمروں میں تین سیڑھیاں اُتر کر
باورچی خانہ موجود تھا ۔ برابر میں نعمت خانہ ۔ سامنے آنگن
اور آنگن کے اطراف میں بنی ہوئی کیاریاں ۔ جن میں نیم
کے دو انتہائی قدیم درخت تھے ۔
پھر ان سب کو محیط کرتی ہوئی دیوار ۔ کل نقشے میں
غالباً صرف یہی ایک چیز تھی ۔ جو زمانہ قدیم سے تعلق
رکھتی تھی ۔ اور مبینہ طور پر اسی لیے انتہائی نازک
بنیادوں پر قائم تھی ۔
اس دیوار کے ہونے نہ ہونے سے کوئی خاص فرق
نہیں پڑتا تھا ۔ اونچائی اتنی ہی تھی کہ کوئی بھی تھوڑی
سی تکلیف جھیل کر اندر آ سکتا تھا ۔ لیکن پھر بھی جب

فوزیہ حسین

بہاروں سے پہلے

مکمل ناول

دیوار کا تکلف کر ہی لیا گیا تھا۔ تو ظاہر ہے دروازہ بھی بنانا تھا۔ سو ایک گیٹ بھی موجود تھا۔ جس کا ایک کواڑ لکڑی کا تھا۔ دوسرا ٹین کا۔ دیکھ کر پہلا خیال تو یہی آتا تھا کہ شاید معماروں نے اپنے فنِ تعمیر کا سکہ بٹھانے کے لیے الگ الگ میٹریل کا استعمال کیا ہے۔ لیکن پسِ پردہ حقیقت کچھ اور تھی۔ شروع شروع میں دونوں لکڑی کے ہی تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ایک داغِ مفارقت دے گیا تو فوری طور پر جو میسر آسکا وہی اس کی جگہ استعمال کر لیا گیا۔ اب جو لگ گیا سو لگ گیا۔ اسے کون تبدیل کرے۔ رنگ و روغن کے سلسلے میں بھی کچھ ایسی ہی بے نیازی روا رکھی گئی تھی۔ اور ٹوٹ پھوٹ کے سلسلے میں تو گویا آنکھیں ہی بند کر لی گئی تھیں۔

بہرحال! اگر مندرجہ بالا چند باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ رہنے کے لیے بری جگہ نہیں تھی۔ بسیرا کیا جا سکتا تھا۔

کل تک اس پر لگا بورڈ کرائے کے لیے خالی ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ مگر آج صبح صبح اسے ہٹا لیا گیا تھا۔

"فری! سحر! چلو جلدی جلدی اپنا سامان رکھواؤ۔"

"ہائے امی! مر جاؤں میں آپ کی سادگی پہ۔ رکھواؤ۔ جیسے دس نوکر بیٹھے ہیں ناں ہمارے۔ خود ہی رکھنا پڑے گا۔" فری بڑبڑاتے ہوئے اپنا سوٹ کیس اٹھانے لگی۔

صبح سے بحث کرتے کرتے یہ وقت آگیا تھا۔ مان کر نہ دیا انہوں نے۔

"نکمے کہیں کے۔" اس نے ایک اور خطاب سے نوازا۔

آشی کو بھی بہت غصہ چڑھا ہوا تھا۔

"پرلے درجے کے مطلب پرست ہیں۔ دونوں اچھے کمرے ہتھیانا چاہ رہے تھے۔ امی نے انکار کر دیا تو ہڑتال کر کے بیٹھ رہے۔ یہ سب کام سے جی چرانے کے بہانے ہیں۔ ابھی سب کچھ سیٹ ہو جائے گا تو چلے آئیں گے ہنستے ہوئے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں تکلیف کیا ہو رہی ہے۔ بس یہی ہے ناں کہ اس کمرے کی کھڑکی اور ایک دروازہ آنگن کی طرف کھلتے ہیں۔ اس میں کون سی جلنے والی بات ہے؟"

"لو یہی تو اصل جلن ہے۔ آنگن کے نیم کے درختوں کی وجہ سے ہر وقت ہرا ہرا جو نظر آئے گا۔ اور وہ ٹھہرے گدھے۔"

"اونہوں۔ بری بات فرش! بھائیوں کو اس طرح نہیں کہتے۔" امی نے ٹوکا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"گدھے نہ سہی امی! لیکن ناقدر شناس تو ہیں۔ ان کے کمرے کی وہ ایک کھڑکی سب پر بھاری ہے۔ جو باغ کی سمت کھلتی ہے۔ اتنا پیارا سماں نظر آتا ہے لیکن ان لوگوں نے تو ضد ہی لگا لی ہے۔"

"اچھا اب جھلانا چھوڑو۔ بس جتنا ہو سکے کر ڈالو۔ باقی کام میں ان سے زبردستی کروا لوں گی۔" امی کچن میں چلی گئی تھیں۔

"ہائے! میری تو کمر رہ گئی۔" سحر زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگی۔

"تھوڑا حوصلہ کرو۔ بس یہ فوم اٹھا کے اوپر رکھ دیں پھر کام ختم سمجھو۔" فرش نے ہمت بڑھائی۔ تو وہ طوعاً و کرہاً پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ آشی کو ترس آنے لگا۔

"رہنے دو سحر! میں اٹھا لوں گی فری کے ساتھ۔ اور ان بدتمیزوں کو تو ایسا مزا چکھاؤں گی ناں۔ کبھی تو آئیں گے چائے پکوڑے مانگنے۔ بتاؤں گی میں بھی۔ ضد کسے کہتے ہیں؟" وہ کپڑے الماری میں ٹھونستے ہوئے دانت پیس کر بولی۔

"ارے آشی! ایسے تو نہ ٹھونسو۔" فری تڑپ اٹھی۔ "تھوڑی قدر کرو۔ زندگی میں پہلی بار پوری الماری نصیب ہوئی ہے۔ تھوڑا سجاؤ سنوارو اسے۔"

"اچھا بس کرو۔ ہو جائے گی انٹیریئر ڈیکوریشن بھی۔ ابھی دم نہیں ہے مجھ میں۔" وہ بے زاری کے عالم میں بولی۔

سحر کسی نہ کسی طرح فوم اندر لے آئی تھی۔ اور اب کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ عجیب و غریب ساخت تھی ان کمروں کی۔ کچھ کچھ تکون سی۔ اور ہر دو کمروں میں ایک تو نارمل سائز کا تھا۔ دوسرا بالکل اس کا پاکٹ ایڈیشن

معلوم ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو چھ کمرے تو صرف نام کو تھے ــــــ صرف پونے چار کمرے تھے اس گھر میں۔

"یہ الماریاں بھی خوب ہیں۔ دیوار کے بیچوں بیچ۔ اوپر نیچے، دائیں بائیں، ہر طرف سے برابر فاصلے پہ۔" سحر اپنی الماری کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے تبصرہ کر رہی تھی۔ پھر ٹھٹک کر رک گئی۔

"کیا مسئلہ ہے؟" وہ حیرانی سے الماری کو تکنے لگی۔

"لگتا ہے دروازہ جم کے رہ گیا ہے۔" اس نے پھر زور لگایا۔ لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔

فری اور آشی بھی متوجہ ہو گئیں۔

"کہیں تالا تو نہیں لگا ہوا؟" فری ٹھونک بجا کے دیکھنے لگی۔

"پتا نہیں پیا! اتنا زور لگایا ہے۔ کھل ہی نہیں رہا۔"

"ٹھہرو، میں چابی لے کر آتی ہوں۔ ہو سکتا ہے امی نے لاک کر دیا ہو۔" فری کچن کی طرف لپکی۔

اب صرف آفرش اور سحرش رہ گئی تھیں۔

"میں بھی کوشش کر ہی دیکھوں۔" آفرش نے آگے بڑھ کر دروازہ کھینچا۔ لیکن پھر چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"کیا ہوا آپی؟" سحرش اس کی بدلتی کیفیت دیکھ کر بولی۔

"مجھے ایسا لگا جیسے۔ جیسے دروازہ اندر سے کھینچ رہا ہے۔" آشی تذبذب کے عالم میں کہنے لگی۔

"ڈرائیں نہیں مجھے۔ ایسے ہی وہم ہوا ہوگا۔" سحر نے بڑی ہمت سے کام لے کر پھر زور لگایا۔ اور اپنے ہی زور میں پیچھے آ رہی تھی۔

دروازہ ایک دم سے کھلا تھا اور۔ انہیں اپنی چیخوں پر اختیار نہ رہا۔ وہ گرتی پڑتی بھاگیں۔

"سچ بتا رہی ہوں میں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کیوں سحر؟" وہ کرسی پر بیٹھی ابھی تک کانپ رہی تھی۔ سارے لوگ اب اسی کمرے میں جمع تھے۔

"جی امی!" سحر نے فوراً تائید کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "بہت خوفناک شکل تھی اس کی۔ پتا نہیں کیسے ہمارے ہوش سلامت رہ گئے۔"

"تو آخر اب وہ، کہاں چلا گیا؟" عنصر دوبارہ کمروں کی تلاشی شروع کرنے لگا۔

"کمال کرتے ہو عنصر! وہ جو بھی چیز تھا یا تھی، بہرحال! اب یہاں نہیں ہے۔ ویسے بھی سحر صاحبہ کی چیخ سن کر تو بڑے بڑے دیو فرار ہو جاتے ہیں۔ وہ تو یوں بھی کوئی چھوٹا موٹا سا آسیب ہی تھا۔" آذر وہیں کرسی پر ٹکا اندازے لگا رہا تھا۔ سحر اس کے سفید جھوٹ پر تلملا گئی تھی۔ مگر ادب ملحوظِ خاطر تھا۔

"خیر۔ تم لوگ پریشان مت ہو۔ دعائیں پڑھ کے ہر دیوار اور الماری پر پھونک دو۔ پھر کوئی نہیں آئے گا۔" دانش نے بہت پیار سے سحر کو تھپکا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔

"چلو یار! اب سوتے ہیں چل کے۔" اس کی دیکھا دیکھی آذر اور عنصر بھی اٹھے۔

لڑکیوں کی تو جان ہی نکل گئی۔

"دیکھیں امی!" آفرش نے فریاد بلند کی۔

"کہاں جا رہے ہو تم لوگ۔ یہ کون سا وقت ہے سونے کا؟ پہلے یہ مسئلہ تو حل ہو جائے۔" امی نے ڈانٹ کر تینوں کو بلایا۔

"امی پلیز۔ ہمیں ان کا کمرا دلا دیں۔" فرش نے خوشامد کی۔ امی کے کچھ کہنے سے قبل ہی دانش چیخ پڑا۔

"کیوں۔ کیوں؟ یہ کیا بات ہوئی؟ پھر ہم کہاں جائیں گے؟ کیا اس کمرے میں؟"

"یہ زیادتی ہے امی! جب سب کچھ اچھا تھا تو کمرہ ان کا۔ اب آسیب زدہ ہو گیا تو ہمیں بخشا جائے۔ ہم کوئی فالتو ہیں کیا؟" آذر بڑے جوش میں تھا۔

"شرم کرو۔ بھوتوں سے ڈرتے ہو۔" آشی نے غیرت دلانے کی کوشش کی۔ "بھائی تو بہنوں کے لیے کیا نہیں کرتے اور تم ایک مشکوک کمرے میں نہیں رہ سکتے؟"

"میں بزدل ہی سہی۔ لیکن یہ کمرا؟۔ اچھا چلو۔ مگر ہماری کچھ شرطیں ہوں گی۔"

"ختم بھی کرو۔" اچانک امی نے کہا۔ "ایک کمرا آسیب والا ہے۔ اور تم لوگوں نے پارسل سمجھ لیا

ہے۔ تم ہے لو۔ تم ہے لو۔ چلو نکلو یہاں سے۔ کوئی نہیں رہے گا یہاں۔" انہوں نے ہانک ہانک کے سب کو باہر نکال دیا۔ اور کمرا بند کر دیا۔ سب منہ کھول کے رہ گئے۔

"مگر امی! اب ہم سوئیں گے کہاں؟" فدی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اسی پیارے پیارے کمرے میں جسے آپ اپنا ورک روم بنانے کو تھیں۔" دانش نے ننھے سے پاکٹ ایڈیشن کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔

"وہاں؟" سحر گھبرا گئی۔ "وہاں تو ہماری مسہریاں بھی فٹ نہیں آئیں گی بھائی۔"

"کیوں نہیں آئیں گی۔ ضرور آئیں گی۔ تم انہیں عرضی بچھانے کے بجائے طولی سمت میں کھڑا کر دینا پھر دیکھنا۔ خاصی جگہ بھی نکل آئے گی۔" دانش نے مشورہ دیا۔

"اچھا۔ اور سوئیں گے کیسے؟ پایوں پہ؟" آشی نے جل کر کہا۔

"نہیں نہیں آپی! ہم یہ ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ ہم ابھی بازار سے اعلا پلٹے کی رسی لے کر آئیں گے۔ آپ لوگ رات کو انہی کے ذریعے مسہری پر فکس ہو جائیے گا۔ گریں گی بھی نہیں۔ اور تھوڑا دوران خون بھی تیز ہو گا۔ سحر کی چارپائی دروازے پہ لگا دیجیے۔ وہ پہرا دینے کا کام کرے گی تاکہ بھوت صاحب دوبارہ تشریف نہ لا سکیں۔"

عنفر نے تو اپنی طرف سے بہترین حل پیش کر دیا تھا۔ لیکن سحر میں اب تاب نہ رہی تھی۔ عنفر سے اُس کی ویسے بھی بہت لگتی تھی۔

"اللہ کرے!" اُس نے خونخوار نظروں سے اُسے گھورا۔ "تمہارے کمرے سے پانچ عدد ڈریکولا اور ایک چھ بھاتی چڑیل برآمد ہوں۔ تم آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے۔ پورے محلے میں دوڑ لگاتے پھرو۔"

"نہیں بیٹا! ایسی بد دعائیں نہ زبان سے نکالو۔" امی نے مسکرا کے کہا۔ "ویسے بھی اب اُن کمروں میں سے ایک تمہارا ہونے والا ہے۔ اس لیے۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کے تینوں لڑکوں کی طرف دیکھا۔ ردِ عمل حسب توقع تھا۔ وہ پھر چیخنے لگے۔

"نہیں امی! یہ نہیں چلے گا۔ ان کا مسئلہ ہے۔ یہی نپٹائیں۔"

"ختم کرو اس بحث کو۔" امی سنجیدگی سے کہنے لگیں۔ "مجھے تو یہ گھر ہی مناسب نہیں لگ رہا ہے۔ اچھا ہے کہ شروع میں ہی یہ واقعہ ہو گیا۔ ابھی تو ہم نے صرف دو ماہ کا ایڈوانس دیا ہے۔ اب تم لوگ کوئی دوسرا گھر دیکھنا شروع کر دو۔" وہ دوبارہ کچن میں چلی گئیں۔

"ہائے! اتنی مشکلوں سے ساری سیٹنگ کی تھی۔ اب پھر سے۔" سحر کو چکر آنے لگے۔ لیکن پھر وہ بہل گئی۔ "خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب ہم لوگ وہ کمرا لیں گے جس کی کھڑکی باغ کی طرف ہے۔"

"خبردار۔" عنفر چلایا۔ "خبردار، جو کسی نے اُس کمرے کا نام بھی لیا تو۔" "سب انہی کمروں میں رہیں گے۔ جو پہلے سے الاٹ ہو چکے ہیں۔"

"اتنے ظالم مت بنو بھائی! مجبوری ہے۔"

"چولہے میں گئی مجبوری۔ بس ہم نے کہہ دیا ناں۔ اب کوئی بھوت ووت نہیں نکلے گا۔" آذر غصے سے بولا۔

"کیوں بھائی؟ تمہاری کوئی رشتے داری ہے اُس سے؟" آشی نے تپانے کی کوشش کی۔

"ہاں ہے۔ اور بہت قریبی ہے۔ چلو عنفر! پھینکو ماسک واسک۔ سب بے کار گیا۔ امی نے ساری گڑبڑ مچا دی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے جیب سے ماسک نکالنے لگے۔ آشی اور سحر ہونق بن گئیں۔

"ڈرپوک کہیں کی۔" دانش نے جاتے جاتے بھی فقرہ اچھالا۔ آشی نے غصے سے ماسک اُٹھا کر کھینچ مارا۔ لیکن وہ نکل چکے تھے۔

اس مکان میں مزید بوجھ اُٹھانے کی سکت نہ رہی تھی لیکن مجبوری تھی۔ عمر جو پوری نہ ہوئی تھی۔ ابھی تک۔ ادھر مکین کون سا خوشی سے بسے تھے۔ اُن کی بھی مجبوری تھی۔

موت برحق ہے لیکن اُسے قبول کرنا آسان نہیں پانچ فٹ دس انچ کے نصر شیخ کا سایہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ کئی نوخیز شجر اور کھلتی کونپلیں اُن کی پناہ میں پھل پھول دے رہی تھیں۔ زمین پہ

اپنے قدم جما رہی تھیں۔ اچانک ہی اُن کے جی میں جانے کیا سمائی۔ آفس کا کام نمٹاتے نمٹاتے اچانک کتاب زندگی کے سارے ورق، ساری شامیں سمیٹیں اور چپ چاپ داستان حیات سے نکل گئے۔

یہ بھی نہ سوچا کہ شیریں بیگم کی ذمے داریاں کتنی بڑھ جائیں گی۔ ابھی تو کوئی فرض بھی پورا نہ ہوا تھا۔ ابھی تو کوئی پودا تناور درخت نہ بنا تھا۔ کسی کی جڑیں مضبوط نہ تھیں۔ ابھی تو وہ سب درسگاہوں کی جنت میں تھے تجربات کا جہنم تو کسی نے بھی نہ دیکھا تھا۔

گھنی چھاؤں میں چین سے، پیر پھیلا کر سونے والے ایک دم سے دھوپ میں آئے تو آنکھیں جل اُٹھیں۔ باپ کا سایہ سر سے اُٹھے تھوڑا عرصہ گزرا۔ حالات کو سمجھنے کا کچھ شعور ملا تو سرکاری گھر کی چھت بھی چھن گئی۔

پھر مسائل اور وسائل کے نقطۂ انطباق پر بس اک یہی گھر ٹھہر سکا۔ سو وہ بچے کھچے خواب اور ساز و سامان کے ساتھ یہاں چلے آئے۔ راضی برضا۔

آذر نے کیمیکل ٹیکنالوجی کے چوتھے سال میں قدم رکھا تھا۔ دانش میتھس ڈیپارٹمنٹ میں آنرز فائنل کا طالب علم تھا۔ نرش نے ہوم اکنامکس اور آدرش نے سائنس کے مضامین لے کر گریجویشن کی تھی۔ آگے یونیورسٹی کا ارادہ تھا۔ لیکن اب ختم کر دیا تھا۔ عنفر نے فرسٹ ایر اور سحر نے نویں کا امتحان دیا تھا۔

شروع سے والدین کی ہمت اور زندہ دلی کا تجربہ کیا تھا۔ ورثے میں بھی یہی عادت حاصل کر لی۔ اسی لیے بہت سے مسائل تو یوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ ہنس بول کر بھول جایا کرتے تھے۔ تعلیم کی مصروفیت، گھرداری کے بکھیڑوں اور پارٹ ٹائم نوکریوں کے جال سے کسی نہ کسی طرح وہ ایک دوسرے کے لیے کافی وقت بچا لیتے تھے۔

اُس دن بھی ہمیشہ کی طرح ایک شام "کچن کے نام" منائی جا رہی تھی۔ آشی اور فدی دھڑا دھڑ پکوڑے تل رہی تھیں۔ اور سامنے آنگن میں بیڈمنٹن کے مقابلے ہو رہے تھے۔ آذر اور دانش کھیل رہے تھے۔ اور عنفر ہر پانچ منٹ بعد یاد دلا رہا تھا کہ اس کی باری آنے میں صرف دو منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ سحر کو نئی نئی چائے بنانے کی ڈیوٹی الاٹ ہوئی تھی۔ سو وہ مسرت بھری نظروں سے کبھی آنگن پہ نظر ڈالتی کبھی چولہے پہ چڑھے پانی کو گھورنے لگتی۔

دانش کا ایک شاٹ ریسیو کرتے کرتے اچانک ہی آذر لڑکھڑا گیا۔

"کر دیا ناں ناک آؤٹ۔" دانش خوشی سے چلایا۔

"جی نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ میرے ہاتھوں میں کچھ دھاگا سا لپٹ گیا ہے۔" وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ پھر چونک پڑا۔ "ارے یہ تو ڈور ہے۔ پتنگ کی۔"

"کہاں ہے، کیسی ہے؟" سب اپنا کام چھوڑ چھاڑ اُس کے گرد اس طرح جمع ہو گئے۔ گویا اُس نے مٹھی میں چھپا رکھی ہو۔

"بھئی، ابھی تو ڈور ہاتھ لگی ہے۔ پہلے اسے تو سنبھال لوں۔" وہ چڑ کر بولا۔ اور آہستہ آہستہ ڈور کھینچنے لگا لیکن ڈور کا یہ حال کہ سرکشی پر اُتر آئی تھی۔ جتنا وہ اُسے کھینچتا، اتنا ہی وہ اُسے کھینچ لیتی۔ یہ ہٹ دھرمی دیکھ کر دانش کو بھی گرمی چڑھ گئی۔ دونوں نے مل کر جو زور لگایا تو بس، فوراً ہی نتائج سامنے آ گئے۔ انتہائی خوش رنگ لیکن کٹی پھٹی پتنگ سامنے کی دیوار سے برآمد ہو رہی تھی۔

"حد ہو گئی یار۔ پہلی بار پتنگ لوٹی وہ بھی کیسی۔" آذر آگے بھی کچھ کہنے کو تھا کہ ایک دم اُس کی زبان کو بریک لگ گئے۔

جہاں سے پتنگ جلوہ افروز ہوئی تھی۔ وہیں سے اب ایک خوش نما لیکن خشمگیں چہرا برآمد ہو رہا تھا۔

"کیوں جی؟ آپ لوگوں کو کس نے گڈی اُڑانا سکھایا؟" جارحانہ انداز میں سوال ہوا۔

"کسی نے بھی نہیں۔ البتہ اگر آپ چاہیں تو۔" دانش بوکھلا کر جانے کیا کیا کہہ ڈالتا۔ لیکن آذر نے لپک کر ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ دیا۔

"جب گڈی ہمارے گھر پہنچ چکی تھی تو آپ لوگوں نے کیوں کھینچی؟" وہ بہت غصے میں تھی۔

"میں نے کوئی نہیں کھینچی۔ وہ تو خود ہی لپٹ رہی تھی۔"

سب نے سٹپٹا کر آذر کو دیکھا تو اُس نے بھی اپنے

جملے پر غور کیا۔

"ڈور بھئی" وہ خفیف سا ہو کر بولا تھا۔

"پھر اس سے کیا ہوتا ہے۔ آئندہ یاد رکھیے گا کہ جو پتنگ آپ کے علاقے میں گرے وہی آپ کی ہوگی اور بس!" دوسری جانب سے ارشاد ہوا۔

"اور اگر نہ یاد رکھا تو؟" عنفر نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"تو پھر یہ مت بھولیے گا کہ اپنی طرف پتنگ کے جھگڑے پر کبھی کبھی قتل بھی ہو جاتے ہیں" غضبناک انداز میں کہا گیا۔ اور پھر چہرا غائب ہو گیا۔

وہ سب تلملانے لگے۔

"دیکھو تو ذرا مس ہانگ کانگ نمبر دو کو۔ قتل پر اتر آئیں۔ کل پانچ فٹ کی ہوں گی اور دھمکی دے رہی ہیں ہمیں۔ تین شیر دل جوانوں کو" عنفر جلے بھنے انداز میں بولا۔

"بھئی مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ بہتر ہے ہم لوگ ایک پتنگ خرید کر دے دو" آشی فکرمندی سے بولی۔

"ارے واہ۔ ہم کوئی دبنے والے ہیں۔ پھٹ گئی تو پھٹ گئی بات ختم۔ آئیں بڑی انٹرنیشنل پتنگ باز"

"ویسے اس ڈور آزمائی سے یہ تو ہوا کہ دیوار کے اس پار ذی روح انسانوں کی موجودگی کا پتا چل گیا ورنہ تو میں سمجھ رہا تھا ادھر کوئی نہیں رہتا" آذر نے کہا۔

"نہیں ایسی بات نہیں۔ میں اور آشی گئی تھیں ان کے گھر۔ اس روز یہ محترمہ تو نظر نہیں آئیں ان کی امی اور چھوٹے بھائی سے ضرور ملاقات ہوئی۔ اس وقت ان خاتون کے رویے میں ایسا روکھا پن محسوس ہوا کہ پھر آشی نے جانے کا نام ہی نہیں لیا۔ ویسے میرے خیال میں وہ رکھائی نہیں، خاموش طبعی تھی" ذری نے تفصیل سے بتایا۔

"رہنے دو۔ خاموش طبع امی کی صاحبزادی اتنی پٹاخہ ہو سکتی ہیں بھلا!۔ ہونہہ! قتل ہو جاتے ہیں" دانش کو پھر وہ دھمکی یاد آگئی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنا ریکٹ اٹھانے لگا۔

"بیٹھے۔ انڈے ہوں گے آپ کے پاس؟"

"کیوں؟ یہ کوئی پولٹری فارم ہے؟" آذر نے بے ساختہ کہتے ہوئے کھڑکی سے جھانکا تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہی مس ہانگ کانگ کھڑی تھیں۔ اور شاید زرش سے مخاطب تھیں۔

"واہ بھئی۔ کیا حوصلہ ہے۔ گھر تک آگئیں" آذر نے دل ہی دل میں داد دی۔

"اصل میں ہمارے گھر میں اس وقت کوئی ہے نہیں جسے بھیج سکوں" وہ خوامخواہ وضاحت پیش کرنے لگی۔ "اس لیے آنا پڑا"

"ارے تو کیا ہو گیا؟" زرش فطری بے تکلفی سے بولی۔ "اچھا ہے ناں" اسی بہانے ایک اور ملاقات ہو گئی۔ آپ کچن میں ایسی آئی"

کمرے کے اندر کھدبد سی مچی تھی۔ "محترمہ غالباً بھول گئی ہیں۔ کچھ دن پہلے انہوں نے کیا کیا فرمایا تھا؟۔ بالکل بدلی ہوئی ہیں آج تو"

"ضرورت پڑنے پر سب کچھ بدل جاتا ہے"۔ دانش نے کافی سوچ کر ایک فلسفیانہ جملہ ادا کیا۔ "مثال کے طور پر آذر بھائی کو ہی لے لو۔ ویسے کتنے شریف بنتے ہیں اور اب کھڑکی کی آڑ لے کر مسلسل تاڑ رہے ہیں۔ گھر آئی مہمان کو" خاصا کرارا وار تھا لیکن آذر شرمندہ ہونے والوں میں سے کہاں تھا۔

"ہاں تو کیوں نہ تاڑوں؟۔ پچھلی دفعہ جو بیرک پر نظر آئیں، وہ سب کی سب تم نے تاڑ لی تھیں۔ آج میری باری ہے"

"اچھا تو اس کی باری لگتی ہے" عنفر حیران ہو کر بولا۔ "غالباً آپ لوگوں کو اس کا ڈر ہوتا ہوگا کہ رد عمل کے بعد کوئی تو ہو، جو مرہم پٹی کرے۔ مشترکہ پٹائی کی صورت میں تو دونوں ہی زمیں بوس فلک بوس ہو جائیں گے"

"ہاں کچھ ایسی ہی سائیکالوجی ہے اس کے پیچھے۔ تمہارے سمجھنے کی عمر نہیں ہے ابھی۔ تم جا کے ذرش سے کہو۔ تھوڑا کم مکھن لگائے۔ ہونہہ۔ ایک اور ملاقات"

وہ اطمینان سے تبصرہ کرنے میں مصروف تھے۔ کہ ذرش واپس بھی آگئی۔ اب اس کے ساتھ آذرش اور سحرش بھی تھیں۔ تعارف کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ وہ غالباً

اپنی قابلیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھی۔

"میں اس دفعہ تیسری بار بی۔ بی اے کے لیے ٹرائی کروں گی۔ اس دفعہ بھی کلیئر نہ ہوا تو سیدھے سیدھے بی اے کر لوں گی پرائیویٹ"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ" دانش آہستہ آہستہ کہتا رہا۔ ادھر وہ بے تکان بولنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔

"پہلے ہم لاہور میں رہتے تھے۔ پھر ابو امارات چلے گئے تو یہاں آگئے"

"ہاں۔ یہاں تو جیسے بہت محفوظ ماحول ہے" آذر بڑبڑایا۔

"ہم میں سب سے بڑے بھائی جی ہیں۔ وہ سرگودھا بیس میں ہوتے ہیں۔ فوج میں ہیں۔ ابھی تو نیا نیا کمیشن ملا ہے یہی کوئی چار پانچ سال پہلے۔ آگے بڑی ترقی کریں گے انشاء اللہ۔ ان کا نام شاہ ذر ہے۔ شاہ ذر الٰہی۔ پھر بہن ہیں۔ عنبر الٰہی۔ پھر بھائی ہے فیصل آباد میں پڑھ رہا ہے ٹیکسٹائل انجینئرنگ۔ اظہر الٰہی۔ پھر میں ہوں۔ شہیر الٰہی۔ پھر چھوٹا بھائی ہے"

"بس کر الٰہی" آذر کے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی نکل گیا۔ اور دانش اور عنفر کی کھی کھی شروع ہو گئی تھی۔

ذری نے گھبرا کر جلدی سے شہیر کا دھیان ہٹانے کو انڈوں بھرا پیالہ تھما دیا لیکن کافی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ بات شہیر کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے تھرا دینے والی نگاہوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر پاؤں پٹختے ہوئے واپس جانے لگی۔ کھڑکی کے پاس سے گزری تو زور زور سے بڑبڑانے بھی لگی۔

"ہاں بھئی۔ لوگوں کو اپنا گھر تو نظر نہیں آتا۔ دوسروں کے خاندان کو نظر لگاتے ہیں۔ وہ بھی صدیوں پرانے لطیفے سنا کے"

"لطیفہ پرانا ہی سہی۔ لیکن پیالہ نیا ہے۔ جلدی واپس بھیجیے گا" آذر نے ڈھٹائی سے آواز لگائی۔

ہدایت پر خاصی پھرتی سے عمل ہوا تھا۔ فوراً تو نہیں لیکن تھوڑی دیر بعد۔ جب وہ تینوں ریکٹ سنبھالے آنگن میں اترے۔

"ٹن" اڑتی ہوئی کوئی چیز جا کے دانش کے سر سے ٹکرائی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ "ارے بھئی۔ یہ تو میں تھا" گڑبڑا کے اس کے منہ سے نکلا۔

عنفر نے جھینپ کر ہتھیار اٹھایا۔ "پیالہ واپس آگیا"۔ اس نے انتہائی مسرت سے اعلان کیا۔ "مگر بھئی یہ تو خالی ہے"

"ارے چپ بھی رہو۔ کہیں" آذر نے بوکھلا کر راہ فرار ڈھونڈنی چاہی لیکن اس سے پہلے ہی وار چل چکا تھا۔

"کھٹاک" دوسرے ہی لمحے اس کے ماتھے پر خاصے رنگین۔ سفید، پیلے اور شاید کچھ نیلے نشان پڑ چکے تھے۔

"شکر ہے۔ اس دفعہ نشانہ تو صحیح لیا" دانش سر سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"صحیح معنوں میں مس ہانگ کانگ ہیں۔ اللہ جانے دوسری والی کیا نکلیں گی۔ مس کولمبو یا حسینہ چار سو بیس"

عنفر دونوں بھائیوں کی حالت زار دیکھ دیکھ کر قیاس لگا رہا تھا۔

پناہ کے لیے قریب ترین جگہ کچن تھا۔ وہ بھاگ کر وہاں پہنچا۔ ذرش اور سحر نے سارا منظر دیکھا تھا سحر تو جلدی سے بھیگا تولیہ لے کر اس کے بال صاف کرنے لگی۔ جبکہ ذرش الٹا اسی کو لتاڑنے لگی۔

"اور کرو۔ گھر آئے مہمان سے بدتمیزی۔ میں کہتی ہوں آخر تم لوگوں کو ضرورت کیا تھی ہماری باتوں میں ٹانگ اڑانے کی؟"

"میں کیا کرتا" آذر نے جھلا کر کہا۔ "منہ سے نکل گیا تھا اس کے بتانے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ زبان پر قابو نہ رہ سکا۔ اور پھر اس نے اس دن کتنی لڑائی کی تھی۔ یاد نہیں؟۔ پرلے درجے کی بدتمیز نہ ہو تو۔ میں نے بھی اتوار بازار سے گندے ٹماٹر نہ لاکے برسائے تو نام بدل دینا"

"ہرگز نہیں۔ غلطی تمہاری تھی۔ بھگتنا تو تھا ہی"

"کیا غلطی تھی؟۔ اس نے منٹوں میں ہماری مردم شماری کر ڈالی تھی۔ حساب برابر ہو چکا تھا۔ حالانکہ ہمارے گھر کی پوزیشن تو بالکل الگ ہے۔ تم نے بتایا نہیں تھا اسے کہ ہم میں سے تین۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ سحر بھی ٹھٹک سی گئی۔ بات سنجیدہ ہو چلی تھی۔

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔" ذری سرد لہجے میں بولی۔ "ایک تمہاری بات منوانے کے لیے میں آپس میں فرق ظاہر کر دیتی۔"

"فرق کی کیا بات ہے۔ حقیقت بہرحال حقیقت ہے مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں بلکہ فخر ہے مجھے کہ اتنے عظیم والدین سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"فخر تو مجھے بھی ہے۔" وہ دکھ سے کہنے لگی۔ "لیکن لوگوں کو یہ بات سمجھانا اور قبول کرنے پر آمادہ کرنا آسان کام نہیں۔ بچپن سے دیکھتی آئی ہوں لوگوں کے عجیب و غریب رویّے۔ اب خود کسی کو بتانے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔"

آذر اس موضوع سے گریز کرنا چاہتا تھا۔ وہ سحر کو ہنساتا ہوا اُلجھن سے نکل گیا۔

ذرش کی آنکھوں میں دھند سی چھانے لگی۔ وہ سب کچھ جو سنا تھا، یاد آنے لگا۔

اگر کسی بس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی تیز رفتاری ہو اور مدِمقابل ایک ایسی کار آجائے جو سرکشی میں اُس سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔ تو انجام کیا ہو گا؟ کوئی بھی اندازہ کر سکتا ہے۔

جب تک بھاری بھرکم انجن رُک سکا، کار سڑک کے کنارے سے اوجھل ہو گئی۔ خود بس بھی جانے کس طرح توازن قائم رکھ سکی۔ ورنہ ٹکراؤ تو ایسا شدید تھا کہ بس کے پیچھے آتی جیپ میں بیٹھے نصر شیخ اور اُن کے ڈرائیور نے تو آنکھیں ہی بند کر لیں۔

بعد میں انہیں اپنی کمزوری پر جو افسوس ہوا وہ الگ تھا۔ کیونکہ جب ہوش دوبارہ بحال ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ بس الٹی پڑی ہے اور ڈرائیور اور کنڈیکٹر دونوں موقعے سے فرار ہو چکے ہیں۔

نصر نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا اندوہناک منظر نہ دیکھا تھا۔ چاروں طرف بکھرا ہوا خون، لاشیں، زخمیوں کی چیخ و پکار۔ حواس مختل ہوتے جا رہے تھے۔ دل تو یہی چاہا کہ اُسی طرح چپکے سے جیپ مڑوا لیں جیسے بعد میں آنے والی گاڑیاں مڑ گئی تھیں لیکن وہ واقعی کمزور تھے۔ اتنی دلیری سے بے حس نہ بن سکے۔ ڈرائیور کو جیپ سمیت قریبی بستی کی طرف دوڑایا۔ اور خود بس میں پھنسے لوگوں کو باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔

پہلے تو صرف یہی دو ہاتھ زندگی اور موت کی اس جنگ کے درمیان آئے تھے۔ پھر ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ اضافی ہاتھ اُن لوگوں کے تھے جن کو اس حادثے میں معمولی زخم آئے تھے۔ اور انہیں اس کا ادراک بھی تھا۔ کہ اس سلامتی پر خدا کا شکر بجا لانے کا اس سے اچھا اور کوئی طریقہ نہیں کہ وہ اپنے ہمسفروں کی اس مشکل وقت میں مدد کریں۔

کچھ ہی دیر میں تمام لوگوں کو بس سے نکالا جا چکا تھا۔ بستی سے مدد آ پہنچی تھی۔ تمام زخمیوں اور ہلاک ہونے والوں کو ہاسپٹل لے جایا جا رہا تھا۔ نصر اب تھک چکے تھے۔ انہوں نے واپسی کے خیال سے جیپ کی طرف قدم بڑھائے۔ ابھی تھوڑا ہی دُور چلے ہوں گے کہ اچانک اُن کے کانوں میں کسی بچّے کی آواز آئی۔

انہوں نے پلٹ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ وہ دوبارہ بس کے اندر گئے۔ لیکن کوئی بچّہ دکھائی نہ دیا۔ ان سیٹوں کے پیچھے سے تو ویسے بھی وہ خود ہر متنفس کو باہر لا چکے تھے۔ انہوں نے بس کے نیچے جھانکا وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ وہ حیران ہی ہو رہے تھے کہ ایک دفعہ پھر وہی آواز آئی۔

اس دفعہ انہیں سمت کا تعیّن ہو گیا۔ آواز اُس سمت سے آ رہی تھی جدھر سے کار اوجھل ہوئی تھی۔ وہ فوراً سڑک کے اُس کنارے تک جا پہنچے اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ خدا کی قدرت کا ایک اور کرشمہ اُن کا منتظر تھا۔

کار سینکڑوں فٹ گہرائی میں پڑی تھی۔ اُس میں موجود کسی شخص کے بچنے کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اس کو کیا کہیے کہ شاید اُس میں ہی سفر کرنے والی ایک ننھی منی سی بچی سڑک سے کچھ نیچے موجود ایک باہر کو نکلی چٹان پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ وہاں کس طرح پہنچی۔ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ صرف یہی کہا جا سکتا تھا کہ نیچے کھائیوں میں موجود موت کی پکار اُس کے لیے تھی ہی نہیں۔ اسی لیے زندگی نے خود کسی کھڑکی کے راستے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اُس کے جسم پر جگہ جگہ خراشیں موجود

تھیں۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ سسک رہی تھی۔ کبھی کبھی آواز بلند بھی ہو جاتی اور یہی بلند آواز اُن کے کانوں تک پہنچی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ آواز دوسرے لوگوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اب تو ایک ہجوم جمع ہو چکا تھا یہاں پر۔

بستی کے لوگوں میں سے ایک دلیر لڑکا اس چٹان پر اُترا اور بچّی کو لیے اوپر آ گیا۔ نصر نے اُسے گود میں لے لیا۔ اُن کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ شاید اب واپس جانا آسان نہ رہا تھا۔ ذمّہ داری کا احساس ایک نئے موضوع کے ساتھ اُن کے سامنے تھا۔

ایک وہی نہیں، دو بچّے اور بھی ایسے تھے جو بس کے حادثے کے دوران اپنا نام پتا گنوا چکے تھے۔ کوئی اُن کا پرسانِ حال نہ تھا۔ اُن معصوموں کی ضرورت کسی کو بھی نہ تھی جو عمر کے لحاظ سے ابھی شیر خواری کی منزل میں تھے۔ حادثے نے یقیناً اُن سے ماں باپ چھین لیے تھے لیکن کوئی تو ہوتا جو انہیں اپنا مانتا۔ نصر تو ہفتے بھر سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس بستی میں قیام کیے بیٹھے تھے۔ لوگ آئے بھی، اپنے لواحقین کی لاشیں شناخت کر کے لے گئے۔ زخمی صحت یاب ہو کر چلے گئے۔ مگر ان بچّوں کی شناخت کسی نے نہ کی۔

نصر اور کتنے دن یہاں ٹھہر سکتے تھے۔ انہیں جانا ہی تھا۔ یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ وہ گھر کی طرف جا رہے تھے۔ چار مہینے ایبٹ آباد میں انتہائی مصروف گزارنے کے بعد دس دن کی چھٹیاں ملی تھیں۔ جو اس طرح گزر رہی تھیں۔ یہ نہ ہوتیں تو اتنا ٹھہرنا بھی ممکن نہ ہوتا۔ سرکاری جیپ تو انہوں نے کب کی واپس بھجوا دی تھی۔ لیکن خود دل کے ہاتھوں مجبور تھے جو اُن بچّوں کو اس طرح بے آسرا چھوڑ کے جانے کو تیار نہ تھا۔ انہوں نے ہاسپٹل انچارج سے حتمی طور پر بات کی۔

"صاف بات ہے جی۔ کسی نے انہیں قبول کرنا ہوتا تو اب تک لے چکا ہوتا۔ لگتا ہے ان کے رشتے داروں نے ان پر بھی فاتحہ پڑھ کر صبر کر لیا ہے۔ بہت سی مصلحتیں ہوتی ہیں جی لوگوں کی۔ آپ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اب تو یہی راستہ رہ گیا ہے کہ انہیں یتیم خانے میں داخل کروا دیا جائے۔" ہاسپٹل انچارج یوں تو بھلے آدمی تھے لیکن باتیں کھری کرنے کے عادی تھے۔

"یتیم خانے میں؟ اس بستی میں کہاں ہو گا یتیم خانہ؟"

"ہے جی۔ ایسی بات نہیں۔ چھوٹا موٹا سا ایک گھر ہے۔ جہاں ایسے بچّے رہتے ہیں۔ لوگ کچھ دے دلا دیتے ہیں۔ اُس کا کام چل جاتا ہے۔"

"کام چل جاتا ہے؟" نصر کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ (اور اگر کبھی دینے والے بیزار ہو گئے تو بے شک رازق خدا کی ذات ہے لیکن میرا بھی کچھ فرض بنتا ہے یا نہیں)

"آپ ایسا کریں۔ یہ بچّے میرے ساتھ کر دیں۔ میں انہیں ایدھی ہوم میں داخل کروا دوں گا۔" وقتی طور پر نصر کو یہی بات سوجھی۔

"اس طرح تو نہیں ہوتا ناں۔ آخر ہمارے بھی تو کچھ اصول ہیں۔ یا تو آپ مکمل طور پر ان کو قبول کر لیں یا رہنے دیں۔ اللہ مالک ہے۔"

نصر اُس کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ خود اُن کے دل میں بارہا یہ بات آئی تھی لیکن یہ بہت بڑا قدم تھا۔ تین تو ایک طرف، وہ ایک بچّے کے لیے بھی یہ فیصلہ کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ اور اس کی ایک وجہ تھی۔ چھ سال ہو گئے تھے اُن کی شادی کو۔ اور وہ بے اولاد تھے۔

وہ اُس احساس، اُس کیفیت سے ناآشنا تھے جو ایک باپ کے دل میں اپنی اولاد کے لیے ہوتی ہے ابھی وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ تھے۔ اور اسی لیے آج مشکل میں پڑے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے۔ ابھی تو ان بچّوں کی محبّت میں وہ سب کچھ چھوڑے یہاں بیٹھے تھے۔ ابھی تو ان کے دل میں ہمدردی کے دریا موجزن تھے۔ لیکن کیا ہمیشہ ایسا ہی رہتا۔ اگر آج وہ اپنے جذبوں سے مجبور ہو کر ان کی ذمّے داری قبول کر لیں۔ اور کل اُن کی اپنی اولاد ہو جائے تب؟ اولاد سے پہلے اولاد کی محبّت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟ ابھی سے یہ کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ اُن کے عزم میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو گی۔

وہ تذبذب کے عالم میں تھے کہ انچارج کی بات نے انہیں چونکا دیا۔

"آپ مجھے مخلص انسان نظر آتے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ بات کہی۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ کوئی آسان بات نہیں۔ اصل میں یہ بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ کسی بھی جگہ ان کی پرورش صحیح طرح نہ ہو سکے گی۔ اگر آپ انہیں اپنے گھر لے جائیں۔ آٹھ دس سال ان کی خبر گیری کریں تو کم از کم یہ کسی حد تک تعلیم اور شعور تو حاصل کر لیں گے۔ اُس کے بعد آپ انہیں کوئی ہنر سکھا دیجیے گا۔ وہ اپنا بوجھ آپ اٹھا لیں گے۔ آپ انہیں شروع سے یہ احساس دلا دیجیے گا کہ آپ کا ان سے کیا رشتہ ہے؟ میں ایک بات کہہ رہا ہوں۔ ورنہ فیصلہ تو آپ نے ہی کرنا ہے۔ یتیم خانہ بھی برا نہیں ہے۔ ہم سب کی مشترکہ کوششوں سے ہی بنا ہے۔"

اُن کی باتیں عجیب تھیں، مشورہ عجیب تھا لیکن نیت شاید بہت نیک تھی۔ اسی لیے بات نصر کے دل کو لگ گئی۔ بچپن تو محفوظ ہو جائے۔ پھر بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ انہوں نے سوچ لیا۔

شیریں بیگم کو یہ توقع بھی نہ تھی کہ ایک دم سے اُن کی گود یوں بھر جائے گی۔

"نصر! میں نے آج تک ایک بچہ بھی نہیں پالا۔ اور یہ تین تین! آپ نے اچھی طرح سوچ لیا ہے ناں کہ آپ نے کیا کیا ہے؟"

"بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں ایک ساتھ تین بچوں کا باپ بن گیا ہوں اور کیا کیا ہے۔ بس یہ ہے کہ تمہیں یہ خبر بعد میں ہوئی۔ خیر فی زمانہ تو یہ بھی اتنا حیران کن نہیں ہے۔ آج کل تو خدا جانے کیسی کیسی سائنسی تحقیقات ہو رہی ہیں۔ تم بھی یہ سمجھ لو کہ اللہ میاں نے تمہیں 'TRILETS' سے نواز دیا ہے بغیر بتائے۔"

"ہاں۔ مختلف عمروں کے 'TRIPLETS'"

"بھئی فی زمانہ ـــ"

"اچھا زمانے کو تو خدارا بخشیں آپ۔ سچ سچ بتائیں یہ بچے آپ کہاں سے لائے ہیں۔ یا کوئی اور بات ہے۔ دیکھیں مجھ سے چھپائیے گا نہیں۔ بہت حوصلے والی ہوں۔ بڑے سے بڑا سچ سن لوں گی۔ لیکن اپنی زبان سے کہہ دیجیے۔" شیریں سنجیدہ تھیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔" نصر کو جب شیریں کی بات سمجھ میں آئی تو سر پیٹ کر رہ گئے۔ "محترمہ! ان کے نقوش پر غور فرمائیں۔ اتنے مختلف زاویوں کے بچے پیدا کرنے کے لیے مجھے تین شادیاں اور کرنی پڑتیں۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میرے سر کے بال اور دماغ سلامت ہیں۔ جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ میں نے ایسی حماقت ہرگز نہیں کی۔"

شیریں نے غور کیا اور پھر سچ مچ قائل ہو گئیں۔ پیارے تو تینوں ہی تھے لیکن شکلوں میں واضح فرق تھا۔ بچیوں میں سے ایک کی آنکھیں سیاہ دوسری کی بھوری تھیں۔ اسی طرح پہلی کے بال بھی سیاہ جبکہ دوسری کے سرخی مائل بھورے تھے۔ نقوش بھی نہ ملتے تھے۔ رنگت البتہ دونوں کی ہی سفید تھی۔ جبکہ لڑکا سنہری رنگت اور تیکھے نقوش کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ تینوں کی عمروں میں بہت کم فرق محسوس ہوتا تھا۔ اندازے سے تینوں ہی دو سال یا ڈھائی سال تک کے لگے۔ کسی شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھائے۔ دونوں بچیاں نصر کے پاس تھوڑا اور سمٹ گئیں۔ لیکن وہ لڑکا بھاگ کر ان کے پاس آ گیا۔ پتا نہیں کیوں؟ شاید اُسے ماں یاد آ رہی تھی۔

شیریں کو لگا جیسے لمحے بھر میں اُن کے دل کی تسخیر ہو گئی ہو۔ اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہوں نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔

"ہوں! اپنا تو اتنی سی دیر میں یہ حال ہو گیا اور مجھے منع کیا جا رہا تھا۔ مشکوک ٹھہرایا جا رہا تھا۔ کیا خیال ہے؟ کر دوں واپس؟ چھوڑ آؤں ایدھی ہوم؟" اب نصر کی باری تھی۔

"نہیں۔" شیریں نے دھیمے سے کہا۔ "اب یہ کہیں نہیں جائیں گے۔ آج بھی نہیں اور دس سال بعد بھی نہیں۔"

"سوچ لو۔ پتا چلا تمہاری اولاد ہوئی اور تم انہیں بھول گئیں۔"

"اولاد ہونی ہوتی تو اب تک ہو چکی ہوتی۔ اور اگر اب ہوئی تو میں سمجھوں گی کہ خدا نے مجھے انعام سے نوازا ہے۔ اور جس کے طفیل انسان کو انعام ملے وہ چیز تو اور زیادہ عزیز ہوتی ہے ناں!"

"قائم رہنا اپنے الفاظ پر۔"

"انشاءاللہ۔"

اور شیریں نے اپنے کہے کو نبھایا۔ نصر کا کام تو ضروریات کی فراہمی تھا۔ اچھی پوسٹ پر ہونے کی وجہ سے انہیں کافی سہولیات میسر تھیں۔ بچوں کو پالنے میں اتنی دقت نہ ہوئی۔ وہ بچے بھی عجیب ہی تھے۔ انہوں نے شیریں کی محبت کو اس طرح قبول کر لیا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے اُن کی ماں تھیں۔ شاید قدرت نے غم کے ساتھ ساتھ انہیں صبر بھی دے دیا تھا۔ انہوں نے کبھی شیریں کو تنگ نہ کیا۔ بس یہ تھا کہ ہمیشہ اُن کے ساتھ ساتھ رہتے۔ اس لیے اسکول میں داخل کروانا مشکل ثابت ہوا۔

پھر وقت کے ساتھ ساتھ دانش، عنصر اور سحر بھی آ گئے۔ عنصر اور سحر تو پلے ہی آذر، آشی اور فدی کے ہاتھوں میں۔ کبھی کسی فرق کا احساس نہ ہوا۔ ہاں دوسرے لوگوں نے وقتاً فوقتاً یہ احساس ضرور دلایا تھا۔ لیکن نصر اور شیریں نے احساس نہ ہونے دیا۔

اب تو وقت کا پہیہ اور بھی بہت سے موڑ مڑ چکا تھا۔ نصر ان کے درمیان نہ رہے تھے۔ وہ سب عمر کی منزلیں طے کر کے باشعور ہو چکے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی یادوں کے آنگن پہ چھینٹے پڑتے ہی رہتے۔ مٹی سے مہک اٹھتی ہی رہتی تھی۔

"عنصر! پکڑ نا۔ ارے اوپر، سر پہ ہے سر پہ۔" "ہے نہیں بھائی تمہارے سر پہ۔ ہاتھ نہیں پھیرو عقلمند، نظر اُٹھا کے دیکھو۔ دیکھو بھی۔" اور جب عنصر صاحب کو اس چیخ و پکار کا مطلب سمجھ میں آیا تب تک پتنگ "علاقہ غیر" میں جا چکی تھی۔

"توبہ ہے عنصر! اتنے دنوں کی پریکٹس کے بعد بھی تم میاں ننھے کے ننھے ہی رہے۔" دانش ہانپتا کانپتا موقع واردات پہ پہنچا۔ "اتنی زبردست پتنگ ہاتھ سے نکل گئی۔"

"بس بھی کرو۔ کیا ہو گا؟ ہو گیا ہے؟ پوری آٹھ عدد تو لوٹ چکے ہو۔ کرو گے کیا ان کا؟" ذری کمرے سے پکاری۔

"اُڑائیں گے۔ اور کیا کریں گے۔" دانش بڑے انہماک سے ڈور لپیٹ رہا تھا۔

"کیا؟" سحر کے ہاتھ سے پنسل چھوٹ کر گر پڑی۔ "واقعی دانش بھائی! آپ نے پتنگ اُڑانی سیکھ لی۔؟"

وہ چھلانگیں مارتی دانش کے پاس جا پہنچی۔

"ارے بھئی نہیں سیکھی تو کیا ہے۔ پتنگ ہی تو ہے کون سا ہوائی جہاز ہے۔ ابھی اوپر جائیں گے اور اُڑا لیں گے۔ ہواؤں کا ساتھ رہے تو پتنگ کی کیا مجال کہ نہ اُڑے۔"

"مئی اور جون میں ہوائیں نہیں چلا کرتیں دانی! لو چلتی ہے لو۔ آرام سے جا کے کمرے میں بیٹھو۔ امی نے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی۔" آشی نے دھمکایا۔

"رہنے دیں آپی! شام میں کون سی لو چلتی ہے؟ پانچ بجنے ہی والے ہیں۔ اگر کسی نے ہماری مہارت کا مظاہرہ دیکھنا ہو تو اوپر پہنچ جائے۔" وہ عنصر کو لے کر چھت کی طرف چل دیا۔

"چلیں آپی؟" سحر کو بے چینی ہو رہی تھی۔ بھائیوں کے اس کارنامے کو دیکھنے کی۔ آشی نے سوالیہ نظروں سے فدی کو دیکھا۔ اُس نے صاف انکار کر دیا۔ آج کل وہ بڑی تندہی سے امی اور بہنوں کے لباس تیار کرنے میں لگی رہتی تھی۔

سحر کے پیہم اصرار پہ آشی اُس کے ساتھ چھت پر آ گئی۔ یہاں تو خوب رونق لگی ہوئی تھی۔

"یہ سب اُن پڑوسن صاحبہ کی ضد میں ہو رہا ہے۔" آشی نے سحر سے سرگوشی کی۔

"ہاں بھئی۔ دانش! تمہارے تو کئی پتنگ باز، کبوتر باز قسم کے دوست بن چکے ہوں گے۔ ذرا آواز تو دینا اپنے کمال کو۔" آذر ہدایتیں دے رہا تھا۔

"ابھی لو۔" دانش نے منڈیر کے پاس جا کر حلق پھاڑنا شروع کر دیا۔ "کمال۔ کمال۔ کہاں ہو بھئی؟"

"ارے یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا پڑوسیوں سے پٹوانا ہے؟" آذر نے گھبرا کر کہا۔

"خود ہی تو کہہ رہے تھے۔ کمال کو آواز دینے کو" دانش نے حیران نظر آنے کی ایکٹنگ کی۔ پھر بولا۔ "اچھا پتنگ اڑانے کے کمال کو۔ وہ تو فی الحال میرے پاس نہیں ہے۔"

"نکمے کہیں کے۔ تمہارے پاس کچھ ہوتا بھی ہے کبھی؟"

"میں نکما ہی سہی۔ آپ دکھا دیں ناں اپنا کمال۔" دانش تلملایا۔

"میرے پاس ہوتا تو تمہیں کیوں کہتا۔ خیر پکڑو ذرا اسے۔"

دانش نے پتنگ پکڑی اور آہستہ آہستہ منڈیر کے کنارے پہنچ گیا۔ اتفاق کی بات ہوا موافق سمت میں چل رہی تھی۔ آذر نے جونہی جھٹکا دیا۔ پتنگ دانش کے ہاتھ سے نکل کر فضا میں بلند ہو گئی۔

"ہوئے۔" سب نے مل کر نعرہ لگایا۔ خوشی سے آذر کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا اگلا قدم کیا اٹھایا جائے اور بس۔ کچھ ہی دیر بعد پتنگ صاحبہ ڈولتی ڈالتی پھر نیچے آ رہیں اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، منڈیر سے رگڑ کھا کر شناخت کھو بیٹھیں۔ گڈی غائب ہو گئی۔ محض گڈی کا کاغذ بچ گیا۔

"ملاحظہ فرمایا خواتین و حضرات! کیا پرفیکٹ لینڈنگ ہوئی ہے۔" دانش نے طنزیہ کہا۔

"خیر ٹیک آف تو اچھا تھا ناں!" آذر ڈھٹائی سے بولا۔ "چلو اب تم کوشش کرو اور عنفر! تم ادھر آؤ۔"

انہوں نے عنفر کو کندھوں پہ چڑھا کے پانی کی ٹنکی کے اوپر پہنچا دیا۔ دانش نے نسبتاً چھوٹی پتنگ کا انتخاب کیا اور عنفر کو تھما کے ڈور لیے پیچھے گیا۔ اس دفعہ ان کا تجربہ کامیاب رہا۔ پتنگ ٹھیک ٹھاک بلند ہو رہی تھی۔ دانش پر ہر طرف سے داد کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ آذر بھی اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"آذر بائی جان! پیچ لڑائیں گے؟" یکا یک ایک پکار سنائی دی۔

"آذر بائی جان!" آذر ہکا بکا رہ گیا۔ "یہ کون بولا؟ بس میں کل ہی تبدیلیٔ نام کا اعلان کر رہا ہوں۔" اسے گمان بھی نہ تھا کہ کبھی اس کے نام کی یہ درگت بنے گی۔

"غور سے سنیں بھائی! بائی جان نہیں بھائی جان کہہ رہا ہوں۔ وہ ادھر۔ اس چھت پہ۔"

عنفر نے توجہ دلائی تو ان سب نے دیکھا۔ ساتھ والی چھت پر بابر بھی پتنگ اور ڈور سمیت موجود تھا۔ اتفاق سے پتنگ وہی تھی جو ان سے مس ہوئی تھی۔ ہمشیرہ محترمہ بھی پاس ایک کنستر پر براجمان تھیں۔

"مجھے پکا یقین ہے۔ اس نے بائی جان کہا تھا۔ 'بس کرا الٰہی' کا بدلہ لے رہا تھا۔" آشی نے خیال ظاہر کیا۔

"ابھی کوئی کسر رہ گئی ہے؟" آذر کو اپنے انڈوں میں لتھڑے بال یاد آ گئے۔

"بھئی، بائی جان بکر از کم بھائی جان سے تو بہتر ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ کہنے والا مس ہانگ کانگ کا بھائی ہے۔" دانش نے مسکرا کر آذر کو دیکھا۔

"اچھا یہ معاملہ ہے۔" آشی چونکی۔ "کل ہی امی کو خبر پہنچاتی ہوں۔"

"خبردار اگر تم نے یہ ڈس انفارمیشن پھیلائی تو۔" آذر چڑ کر بولا۔ "میرا دماغ سلامت ہے۔ میں کیوں کرنے لگا ایسی غلطی۔" وہ بول ہی رہا کہ شور مچ گیا۔

"بو کاٹا۔" ساتھ ہی کنستر دھما دھم بجنے لگا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی لاڈلی پتنگ کو نیچے آتا دیکھ رہے تھے۔ بھائی جان اور بائی جان کی بحث میں اپنی پتنگ کا دھیان رکھنا تو بھول ہی گئے۔

"افسوس!" آشی نے طنزیہ کہا۔ "تین شیر دل جوان ایک بچے سے ہار گئے۔"

"سب ان لوگوں کے ہاتونی پن کی وجہ سے ہوا۔" سحر غصے سے بولی۔ آذر اور دانش کان دبا کے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اچانک ان کی نظر شہتوت کے درخت پر پڑی، یہ کیا نظر آ رہا تھا۔ لال پیلا سا۔

"ارے دانی! ہماری پتنگ تو ہمارے درخت میں ہی اٹک گئی۔ چلو نکالیں اسے۔" آذر خوشی سے چلاتا

ہوا نیچے بھاگا۔ باقی دونوں نے بھی تقلید کی۔

"چلو اناڑی پن کا کچھ تو فائدہ ہوا۔ پتنگ اتنی اونچی بھی نہ ہو سکی کہ کسی اور کے آنگن میں گر جائے۔" آشی ہنستے ہوئے سحر سے کہہ رہی تھی۔

جولائی کی آمد آمد تھی لیکن گرمی کی شدت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی تھی۔ اور اس گھر میں تو پرانے پنکھوں سے بھی ٹھیک ٹھاک کام چل جاتا تھا۔ لیکن یہاں تو برا حال تھا۔

البتہ آج کچھ بادل راستہ بھول کر ادھر آ نکلے تھے۔ وہ سب امی کے کمرے میں موسم کی تازہ ترین صورتحال پر بحث کر رہے تھے۔

"میرا خیال ہے آج بارش ہو گی۔" دانش نے بادلوں کا بغور معائنہ کیا۔

"اور میری دعا ہے۔ آج بارش ہو ہی جائے۔" عنفر نے ٹکڑا لگایا۔

"اس دفعہ کی گرمی نے تو انجر پنجر ڈھیلے کر دیے ہیں۔ اگلے سال میں ضرور اے سی خرید لاؤں گا۔" آذر نے بڑے وثوق سے کہا۔ ذری کو ہنسی آنے لگی۔

"سنو بھی، سب لوگ۔" اس نے اہل محفل کو متوجہ کیا۔ "اگلے سال آذر کا پرائز بانڈ نکلنے والا ہے۔"

"ایک تو تم کبھی خوش نہ ہونے دینا۔" آذر چڑ گیا۔ "میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ اگلے سال میری تعلیم مکمل ہو جائے گی۔ پھر مجھے اچھی سی جاب مل جائے گی۔ پھر۔"

"پھر تم پر نوٹوں کی بارش ہونے لگے گی۔ پھر تمہاری آنکھ کھل جائے گی۔ پھر تم دیکھو گے کہ اصل میں نوٹ نہیں، چھت سے پانی برس رہا ہے۔" ذری نے کہانی مکمل کر دی۔ آذر بھنا کر رہ گیا۔ اس نے موضوع ہی بدل دیا۔

"عنفر چندا! ذرا کھڑکیاں تو کھولنا۔ درخت ہل رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہوا تیز ہو رہی ہے۔" اس نے عنفر کو پکارا۔ وہ منہ بناتا ہوا اٹھا۔

"ہمیشہ میری ہی یاد ستاتی ہے آپ کو۔ نمبر دو تو بس بیٹھنے کے لیے ہیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا تعمیل حکم کر رہا تھا۔

"ایک تو اس مکان میں اتنی کھڑکیاں ہیں۔ دھلر اور ہو یتیں تو اچھا بھلا اسکواش کورٹ بن جاتا تھا۔"

"شاباش!" ایک دم سے اتنی تیز ہوا اندر آئی کہ سامنے دروازے کھڑکیاں بج اٹھیں۔ ساتھ ہی بارش کے قطرے بھی تیزی سے اندر آنے لگے۔

"کیا بات ہے یار عنفر! ہوا کے ساتھ ساتھ بارش کا بھی ذائقہ چکھا دیا تم نے۔" آذر خوش ہو کر بولا۔

وہ سب کھڑکیوں کے پاس جمع ہونے لگے لیکن امی نے ڈانٹ ڈپٹ کر ساری کھڑکیاں دوبارہ بند کروا دیں تو پھر سب باہر نکل آئے۔ کہ اتنے پیارے موسم سے محروم رہنا تو گوارا نہ تھا۔ برستی بارش انہیں بار بار بلا رہی تھی۔ تینوں لڑکے تو فوراً کھلے میدان کی طرف بھاگے۔ آشی اور ذری درختوں کی چھاؤں میں کھڑی ہو گئیں۔ پتوں سے چھن چھن کے بارش کے قطرے ان پر گر رہے تھے۔ اتنی غضب کی گرمی کے بعد ایسی حسین بارش آئی تھی کہ جی خوش ہو گیا تھا۔ اصل میں موسموں کا رنگ تو درختوں پر ہی سجتا ہے۔ مکان کتنا پرانا سہی لیکن اس میں لگے درخت بہت شاندار تھے۔

وہ آنگن میں ٹہلنے لگیں۔ سحر تو بڑے مزے سے بھیگ بھی رہی تھی۔ اور گیت بھی گنگنا رہی تھی۔ سامنے میں انہوں نے دیکھا۔ عنفر حیران پریشان چلا آ رہا تھا۔

"پتا ہے، باغ کی طرف پانی تیزی سے جمع ہو رہا ہے۔" اس نے آتے ہی خبر سنائی۔

"وہ تو ہو گا ہی۔ برسات جو ایسی غضب کی ہے۔" سحر نے بے پروا سے انداز میں کہا۔

"ہاں۔ آپ کی غضب کی برسات صرف اوپر آسمان ہی سے نہیں۔ دائیں بائیں ہر طرف سے گھر میں داخل ہو رہی ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں کہتا ہوا واپس چل دیا۔ انہوں نے بھی اس کی تقلید میں باغ کا رخ کیا۔ واقعی وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ اصل میں یہ مکان نشیب میں تھا۔ باقی سب نے اپنے گھروں کو اونچا کر لیا تھا۔ سڑک بھی کچھ اونچائی پر تھی۔ اس لیے ہر جگہ کا پانی ان کے حصے میں آ گیا تھا۔

امی بھی موجود تھیں۔ سحر ان کے پاس چلی گئی۔

"اب کیا ہو گا امی؟"

"کچھ نہیں ہوگا چندا! تمہارے بھائی تدبیر کر تو رہے ہیں۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔
عنصر، آذر اور دانش مٹی کا ننھا سا بند بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن فوراً ہی کیا ہوا کہ تیزی سے ایک گاڑی موڑ کاٹتی ہوئی گزری اور اس کے تیز چھینٹوں نے بے چارے بند کو پانی پانی کر ڈالا۔
"کیا مصیبت ہے؟" آذر جھنجلا کر ہٹ گیا۔
"دفع کرو اسے۔" دانش بھی تنگ آ گیا تھا۔ "کچھ اور سوچنا چاہیے۔"
ابھی وہ سب سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک فری چلائی۔ "آذر، دانی۔ دیوار کو دیکھو۔"
سب نے اس کی نظروں کی تقلید کی۔ اور ساکت رہ گئے۔
احاطے کی دیوار ایک طرف سے ڈھے رہی تھی۔ اور پانی انتہائی تیزی سے اندر آ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سب برآمدے میں کھڑے تھے اور اُن کے اردگرد پانی ہی پانی تھا۔ سیڑھیوں کی وجہ سے پانی کمروں اور برآمدے میں داخل نہ ہو سکا تھا۔ ورنہ صورتِ حال مختلف ہوتی۔ ابھی تو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کسی جزیرے کے مکین ہوں۔
سب سے پہلے عنصر نے لب کھولے۔
"اسے کہتے ہیں غضب کا سیلاب۔"
سحر جھل سی ہو کر مسکرائی۔ "بھئی، سیلاب بھی تو موسم کا حصہ ہوتے ہیں ناں!"
"اور کیا؟" دانش چڑ کے بولا۔ "اور ہم سیلاب کا حصہ بن گئے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے!"
یکایک فری کو یاد آیا۔
"اُف امی! کھانے کا کیا ہوگا؟ کچن میں تو پانی بھرا ہوا ہے۔"
"اس کی فکر مت کرو۔ سارا سامان تمہارے ورک روم میں ہے۔"
"ارے امی! کیا آپ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مستقبل قریب میں سیلاب آنے والا ہے؟" آذر خوش ہو کر بولا۔

"نہیں۔" امی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ "اصل میں بارش شروع ہوتے ہی وہاں کی چھت ٹپکنے لگی تھی۔ چلو اب ذرا جلدی سے وہاں اسٹوو تو فٹ کر دو۔"

"زبردست۔ اب مزا آئے گا اس کمرے کو استعمال کرنے کا۔" آذر نے سارا انتظام مکمل کرتے ہوئے کہا۔
سحر اور فری منہ بنا کر اپنی چیزیں وہاں سے ہٹانے لگیں۔ فری کے تو کتنے ہی فن پارے وہاں پڑے تھے۔ لیکن آج تو مجبوری تھی۔ کچن سے اُن کے کمرے ہی نزدیک ترین تھے۔ اس لیے زد میں آ گئے تھے۔
سحر نے شروع میں کچن کی لوکیشن دیکھ کر خاصی مسرت کا اظہار کیا تھا لیکن اب تو سخت بدمزا ہو رہی تھی۔ ایک وہی کیا، سب بیزار تھیں۔ ہر دل میں ایک ہی خوف تھا۔ مزید بارش ہو گئی تو کیا ہوگا؟
"ہنسو۔ لو لو بھئی۔ یہ رونی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟" آذر نے میز کو ہولے ہولے تھاپ دینی شروع کی اور دانش تان اُڑانے لگا۔

؎ آپی ذرا حلوہ پکا دو فری کہ ساون آیا
کوئی مجھے جلنے پلا دو فری کہ ساون آیا

"بس بس۔ کوئی نہیں ملے گی جلنے والے۔ ایک اسٹوو پر کیا کیا کام ہوگا۔" امی نے اس کی فرمائش کو ویٹو کر دیا۔ لیکن وہ گاتا ہی رہا۔ جانتا تھا۔ ہونا وہی ہے جو امی نے کہہ دیا لیکن اپنی عادت کا کیا کرتا۔ مستی کیے بغیر تو اس سے پریشانیاں بھی ہضم نہ ہوتی تھیں۔ ایک یہ بھی تو طریقہ ہوتا ہے ناں زندگی کو قبول کرنے کا۔ ہر مشکل کو ایڈونچر سمجھ لیا جائے۔
بھلا اس شہر میں برسات کی وہ لہر کہاں۔ وہ تو اتفاق سے اُس دن موسم موڈ میں آ گیا تھا۔ ورنہ پھر تو وہی حال تھا۔ ہوائیں اور بس ہوائیں۔ آہستہ آہستہ پانی اُترنے لگا۔ تین چار دنوں بعد کچن بھی قابلِ استعمال ہو گیا۔ چلو ایک مسئلہ تو حل ہوا۔ زرش کو اپنا ورک روم واپس ملا۔ آذر، ش اور سحر ش کا سٹڈی روم بحال ہوا۔ اور امی کے کچن کی رونقیں لوٹ آئیں۔ لیکن ایک مسئلہ ہنوز توجہ طلب تھا۔

"اب تو پانی اُتر گیا ہے۔ اب اس دیوار کے لیے بھی کچھ سوچو آذر۔"
"اس کے لیے کیا سوچیں امی! آخر اس نے بھی تو ہمارے لیے کچھ نہ سوچا۔ عین وقت پر دغا دے گئی ظالم۔"
"ارے کاہل اعظم سائیں نے تو جو کیا سو کیا۔ اب اگر تم نے کچھ نہ کیا تو پھر باقی سیلاب اور ڈاکو ہی رہ جاتے ہیں کچھ کرنے کے لیے۔"
"ڈاکوؤں سے ڈرنے کی بھلا ہمیں کیا ضرورت ہے۔ آئیں گے تو ہم بھی اُن کے ساتھ مل کر ڈھونڈیں گے۔ ہمارے پاس تو ظاہر ہے کچھ ہوگا تو انہیں ملے گا۔ البتہ اُن کے طفیل شاید ہمیں کسی تہہ خانے یا خزانے کا سراغ مل جائے۔" کہتے کہتے آذر پھدک کر بھاگا۔ کیونکہ امی کے ہاتھ اب چپل کی طرف بڑھ رہے تھے۔
"ویسے یہ کام تو مالک مکان کا تھا۔" عنصر اینٹوں اور گارے سے زور آزمائی کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"ہماری دولت اور محنت تو خوامخواہ ضائع ہو رہی ہے۔"

"وہ دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ جب تک وہاں سے آ کر تمہاری دیوار بنائیں گے۔ تب تک پانی مزید گل کھلا چکا ہوگا۔ کیونکہ برسات تو اب رُکے گی نہیں۔" دانش نے اینٹ جماتے ہوئے کہا۔
"چلو بن گئی دیوار بھی!" آذر نے آخری اینٹ دانش کو تھمائی اور خود زمین پہ پیر کے پھیلا کے اپنے فنِ تعمیر پر غور کرنے لگا۔ دانش بھی اُس کے ساتھ آ بیٹھا۔
"دیوار تو فرسٹ کلاس بن گئی ہے لیکن۔ خدا کرے بارش کا بہاؤ بھی برداشت کر سکے۔" اُس کی نظریں آسمان پر جم گئیں۔
آذر چپ رہا۔ وہ جانتا تھا کہ گھر کے کونے کونے کی طرح اس دیوار کو بھی پلاسٹر کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن اتنا کچھ وہ افورڈ کیسے کرتے۔ محض بابا کی پنشن اور اس کی اور دانش کی تھوڑی بہت آمدنی سے کیا کیا بوجھ اٹھایا جا سکتا تھا۔
(بس یہ سال گزر جائے کسی طرح۔ تو میں)
"آذر بھائی پچ۔"

کسی نے جان کہتے ہوئے بمشکل زبان روک لی تھی۔ آذر چونک کے مڑا۔ بابر کھڑا ہوا تھا۔ بس کر الٰہی خیر۔
"ہوں۔ کیا چاہیے؟"
"جی مجھے تو کچھ نہیں چاہیے لیکن اگر آپ لوگوں کو سیمنٹ چاہیے تو ہمارے گھر سے آ کر لے لیں۔ اصل میں ہم نے گھر ٹھیک کروایا تھا ناں تو کافی بچ گیا تھا۔" وہ رُک رُک کر کہہ رہا تھا۔
آذر کے فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ (یا ایکدم کایا پلٹ!)
اُدھر دانش اور عنصر میں معنی خیز نظروں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔
"یار بابر!" دانش بڑی لگاوٹ سے بولا۔ "یہ بات خاص طور پر آذر بھائی سے ہی کہنی تھی؟ یاد کرو شاید دانش بھائی جان کو بھی کچھ کہنا ہو۔"
"نہیں۔ میری یادداشت اتنی کمزور نہیں۔" فوراً جواب ملا۔ اور دانش بُری طرح جل گیا۔
"جائیے آذر بھائی! ذرا سیمنٹ تو لے آئیے۔" اُس نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ لیکن آذر کی حالت پتلی تھی (اب گھر بلا کے مارے گی۔)
"کیوں ہم محتاج ہیں کیا؟ بغیر سیمنٹ کے بھی رہ سکتے ہیں۔" اُس نے انا کا دامن تھامنا چاہا۔
"بے شک آپ سیمنٹ کے بغیر رہ سکتے ہیں لیکن افسوس کہ پلاسٹر آپ پر نہیں دیوار پر کرنا ہے۔ جائیے شاباش۔ اکڑیے گا بعد میں۔ ابھی تو یہ پڑوسیانہ خلوص قبول کرنے میں ہی بھلا ہے۔" دانش اور عنصر نے زبردستی اُسے بھیج دیا۔
علاقہ غیر جانے اور واپس آنے کے دوران اُسے مسلسل یہی ڈر رہا کہ ابھی کہیں سے گولہ باری شروع ہو جائے گی لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ البتہ ایک لمبی سی چوٹی اور کاسنی آنچل کی جھلک بار بار دکھائی دی۔ شاید کوئی اُسے چھپ چھپ کر دیکھ رہا تھا۔
گھر واپس آتے آتے اُس کی بابر سے اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔

"توبہ ہے ان لوگوں سے۔ ایسا لگتا ہے خوب دھینگا مشتی ہوئی ہے یہاں پہ۔" آشی جھنجلاتے ہوئے کمرا صاف کر رہی تھی۔

کوئی ایک چیز بھی اپنی جگہ پر نہ تھی۔ کپڑے الماری سے باہر لٹک رہے تھے۔ دراز بے طرح طرح کے منہ سے جھانک رہے تھے۔ غسل خانے کا کوئی بھی نلکا پوری طرح بند نہ تھا۔ کتابوں کا ایک ریک تو اوندھے منہ گرا پڑا تھا۔ غالباً عنصر نے کالج جاتے وقت اپنی کتابیں کھینچی تھیں۔

"ایک سے بڑھ کر ایک موجود ہیں اس گھر میں۔" وہ بستر جھٹک کرتے ہوئے بڑبڑائی۔

اتنے میں بیل بجی۔ اس نے وہیں سے جھانک کے دیکھا۔ پھر دروازے تک چلی آئی۔ کوئی نوجوان سا لڑکا تھا۔

"کون؟"

"وہ جی۔ بجلی کا میٹر چیک کرنا ہے۔"

"اچھا!" اس نے دروازہ کھولا۔ اسے گائیڈ کر کے اندر جانے لگی تا کہ اندرونی دروازے بند کر سکے کہ پیچھے سے آنے والی آواز نے چونکا دیا۔

"سنیں۔ آپ کا میٹر تو چل ہی نہیں رہا۔" آشی ہول گئی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے تو کبھی کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی۔"

"اب یہ تو میں نہیں جانتا۔ آپ خود ہی دیکھ لیجیے۔"

آشی نے اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھ کر دیکھنا چاہا۔ لیکن اسی وقت۔ اس کی گردن سے کوئی سخت چیز آ لگی۔ وہ سن ہو گئی۔

"اندر چلو۔ اور تمہارے انداز سے کچھ ظاہر نہ ہو۔" تحکمانہ لہجے میں کہا گیا۔

آشی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھی۔ دباؤ تھوڑا اور سخت ہونے لگا۔

"بالکل سیدھے قدم۔ سمجھیں۔"

عنصر نے لات مار کے دروازہ کھولا۔ "انڈرسٹینڈنگ سسٹم ہے اس گھر کا۔ جب دیکھو دروازہ کھلا۔"

وہ برآمدے کی طرف آ رہا تھا لیکن پھر ٹھٹک گیا۔ ایک اجنبی سا شخص بہت تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"شکر ہے آپ آ گئے۔ میں آپ کو فون کرنے ہی جا رہا تھا۔ اندر چلیے۔ خالہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔" اس نے عنصر کا ہاتھ پکڑ کے اسے آشی اور ذری کے کمرے کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔

عنصر بوکھلا کے اس کے ساتھ آگے بڑھا لیکن پھر رک گیا۔

"تم کون ہو؟" اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ اس شخص نے انتہائی پھرتی سے اسے جھٹکا دیا اور اس کا بازو پیچھے کی طرف مروڑا۔ اور پوری طاقت سے اندر دھکیل دیا۔

ایک عجیب منظر اس کے سامنے تھا۔ آشی، ذری اور سحر تینوں امی کے ساتھ لگی بستر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ذری کے ہاتھوں میں تو ایک رسالہ بھی تھا۔ جو آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ امی کے ہاتھوں میں تسبیح تھی۔ وہ بار بار تینوں لڑکیوں پر کچھ پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ آشی اور سحر کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

ان کے علاوہ کمرے میں دو افراد اور بھی تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ٹی ٹی موجود تھیں۔ اسے اندر دھکیلنے والا خود باہر ہی رہا تھا۔

عنصر نے گہری سانس لی۔ "خدایا! جب یہ جائیں تو ہم سب صحیح سالم ہوں۔" اس کے دل میں بے ساختہ یہی بات آئی۔

ایسی مصیبت آتی ہے تو تمام چیزوں سے ہٹ کر صرف زندگی اور عزت کا خیال باقی رہ جاتا ہے۔

"کاش آذر بھائی اور دانش ہوتے۔" اس نے سوچا لیکن پھر خود ہی ذہن جھٹک دیا۔ "ہوتے تو وہ بھی ٹریپ ہو جاتے اور نہ بھی ٹریپ ہوتے تو کیا کر لیتے۔ بہنوں کی موجودگی کمزور بنا دیتی ہے۔ انسان مجبور ہو جاتا ہے۔"

عنصر خوفزدہ ہونے لگا۔

(ہمارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ مکینوں کی زبوں حالی تو گھر کی دیواروں پر لکھی ہے۔ پھر! پھر یہ لوگ

کیا کرنے آئے ہیں؟)

وہ رہ نہ سکا۔ "آخر آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ بس آپ لوگ اس کمرے تک محدود رہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے ہم۔" اس نے بے حد مہذب لہجے میں کہا۔

عنصر کے حوصلے بڑھے۔ "یقین کریں ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ہم نے کب کہا کہ آپ کے پاس کچھ ہے۔ ایسی امید ہوتی تو تلاشی نہ لیتے آپ کی۔ بس کچھ اطلاعات تھیں جن کی وجہ سے یہاں آنا پڑا۔ ورنہ ہم وقت ضائع کرنے کے قائل نہیں۔" وہ بڑے مطمئن انداز میں کہہ رہا تھا۔

"کیسی اطلاعات؟ مجھے بتائیں شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔"

"نہیں اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہمارے ساتھی لے رہے ہیں راؤنڈ پورے گھر کا۔ وہ اپنی مدد آپ کر لیں گے۔"

"یار! اس کمرے کی تلاشی نہیں لینی؟" دفعتاً دوسرے کو خیال آیا۔ اور تینوں بہنوں کا دم اٹکنے لگا۔ اسی کمرے میں تو ان کی ساری جمع پونجی تھی۔ آورش اور زرش نے وقتاً فوقتاً پیسے جمع کر کے سیٹ بنوائے تھے۔ اس کے علاوہ امی کے کچھ روپے بھی تھے۔ ماہانہ خرچ کے۔

"نہیں رہنے دو۔ پہلے ان تینوں کی طرف سے اطلاع آنے دو۔"

اور ان کے دل میں تھوڑا سکون اترا۔ قیامت میں تھوڑی سی تاخیر ہے! عجیب سا حال تھا۔ گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ پچیس تیس منٹ ایسے اعصاب شکن ثابت ہو رہے تھے کہ انہیں لگ رہا تھا گویا صدیاں بیت گئیں۔ آشی سوچنے لگی۔ پتا نہیں ان لوگوں کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ جن کے گھر ایسے لوگوں کا کئی گھنٹوں تک قیام رہتا ہو گا۔

اتنے میں تین لڑکے اور اندر آ گئے۔ کتنے بے فکر تھے وہ سب۔ جیسے یقین ہو کہ قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کوئی نقاب یا رومال استعمال کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی تھی۔ ان کے چہروں پر کوئی تاثر نہ تھا۔ عجیب بے حس سا انداز تھا سبھوں کا۔

"چلو یار! پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔" آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

سگنل ملتے ہی دونوں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ "امید ہے آپ لوگ تعاون کریں گے۔" پہلے نے اسی اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ "فون تو کاٹا جا چکا ہے۔ لیکن اگر شور مچانے کا خیال آئے تو یہ ضرور ذہن میں رکھیے گا کہ ہمارے دو ساتھی اطراف میں ہی رہیں گے۔ کم از کم مزید آدھے گھنٹے تک۔ اس لیے ہر صورت میں نقصان آپ کا ہی ہو گا۔"

"اوکے؟" اس نے دروازے کے پاس پہنچ کر کہا۔

(جاؤ بھی خدا کے واسطے۔ تم۔ تہذیب کی اعلا مثال۔)

دروازہ لاک ہونے کی آواز آ رہی تھی۔

"ارے! امی کا سیٹ بھی اسی کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ یہ بھی بچ گیا۔" آشی چھان پھٹک کر رہی تھی۔

"عجیب عقلمند ڈاکو تھے۔ پھر کیا ڈھونڈتے رہے۔ پورے گھر میں۔ سامان بھی یونہی چھوڑ گئے۔ ورنہ میں سمجھ لیتا کہ کباڑیوں کا گروپ ہے۔"

"کیا بدتمیزی ہے عنصر! ہمارا سامان اتنا برا تو نہیں ہے۔" آشی نے سرزنش کی۔ عنصر گھوم کر جائزہ لینے لگا۔

"ہاں، چند چیزوں پر نظر نہ ڈالی جائے تو واقعی اتنا برا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس ٹی وی پہ جب تک دو تھپڑ نہ پڑیں چلتا ہی نہیں۔ اچھے بھلے افراد کو بھی بس کنڈکٹر بنا دیتا ہے یہ۔ اور اس فریج پہ۔ ذرا ہاتھ بہک جائے، ایسا کرنٹ مارتا ہے کہ اگلے پچھلے سب گناہ یاد آ جاتے ہیں۔ اور ہاں اس واشنگ مشین پہ۔ جو چلتی ہے تو اس کا ہر جز والگ سُر تال سے بجتا ہے۔ سیمی پاپ کلاسیکل میوزک نشر ہوتا ہے اور۔"

"اور ہمارے بھائی پہ، جنہیں اتنا نہیں پتا کہ کالج جانے کے لیے کیسے تیار ہوا جاتا ہے۔" آشی نے بات مکمل کر دی تو وہ پلٹ پڑا۔

"اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟۔ اتنا نہیں پتا کہ میٹر ریڈنگ والوں کے پاس ایک کاپی بھی ہوتی ہے۔"

وہ سب ذہنی ٹینشن دُور کرنے کے لیے یونہی اوٹ پٹانگ ہانک رہے تھے۔ اگرچہ ڈاکوؤں کو گئے اب کافی دیر ہو چکی تھی۔ لیکن اعصاب بُری طرح منتشر تھے۔ سحر نفل ادا کر کے خود کو پُرسکون کر رہی تھی۔ وہ بہت دیر سے مصلّے پر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

آذر بالکل خاموش تھا۔ وہ امی کو دیکھ رہا تھا۔ آج پہلی بار اُن کے چہرے پر مایوسیوں کا غبار نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ برسوں کی مسافت ایک دن میں ہی طے کر ڈالی ہو۔

ذری بھی محسوس کر رہی تھی، کہیں پہ کچھ نہ کچھ ضرور گڑبڑ ہے۔ لیکن اپنے احساس کو وہ ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ منتظر تھی کہ سب سونے کے لیے جائیں تو وہ امی سے استفسار کرے۔

دانش عنصر پہ بگڑ رہا تھا۔ "ہم نے ذرا حاضر دماغی سے کام نہ لیا۔ دروازہ کھلا دیکھا تھا تو اندر جانے کے بجائے پولیس کو اطلاع دے دیتے تو ابھی صورت کچھ اور ہوتی۔"

"ہاں۔ خود ہوتے ناں تو دیکھتا کس کا دماغ حاضر رہتا۔ ہمارے گھر کا دروازہ تو اکثر و بیشتر کھلا رہتا ہے میں اکثر و بیشتر ایسی اطلاعات فراہم کرتا رہتا تو ایک دن پولیس مجھے حوالۂ حوالات کر کے تمہیں اطلاع فراہم کر دیتی۔"

"بس بس رہنے دو یہ بہلانے بازیاں۔ دیکھ لی تمہاری بہادری۔"

"اچھا بچو! اگلی دفعہ آئیں گے تو تمہیں آگے کر دوں گا پھر۔"

"عنصر! چپ رہو۔"

اچانک امی زور سے چیخی تھیں۔ اور پھر بلک بلک کے رو پڑیں۔ "مت یاد دلاؤ بار بار۔ مت ذکر کرو۔"

آذر اُٹھ کر فوراً اُن کے پاس پہنچا۔ "صبر کریں امی! قسمت کو یہی منظور تھا۔ بھول جائیں۔" وہ انہیں تھامے بھرائی ہوئی آواز میں تسلیاں دے رہا تھا۔ باقی سب بھی چپ چاپ اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ اگرچہ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ ہوا کیا؟۔

صرف ایک دن میں حالات کتنے تبدیل ہو گئے تھے

"تو گویا اب ہمارے پاس بیلنس میں کچھ نہیں رہا۔" دانش نے گہری سانس لی۔ وہ اپنے اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے تھے۔ مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"ہاں۔۔ یہی سمجھو۔ میں زیادہ تر رقم نکلوا لایا تھا۔ کل کی ہی تو بات ہے۔ ابھی تو میرے اور امی کے سوا کسی کو بھی پتا نہ تھا۔ پتا نہیں کس طرح اُن لوگوں کو خبر ہو گئی۔"

"ان کے گرگے ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ بینک سے ہی پیچھے لگ گئے ہوں گے۔" دانش اُٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔ "کیا خیال ہے۔ اس دفعہ کچھ زیادہ ہی لمبی آزمائش نہیں ہو گئی؟" وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

آذر خاموشی سے چھت کو گھورتا رہا۔

"اب یہ ہے۔" دانش کہتا رہا۔ "کہ اندازِ زندگی تھوڑا تبدیل کرنا پڑے گا۔ ابھی تک نرمی گرمی چل رہی تھی اب تھوڑے سخت دنوں کا مزا بھی چکھنا پڑے گا۔ بجٹ انتہائی ٹائٹ کر کے اپنے ہی پیسوں میں گزر بسر کی عادت ڈالیں گے۔ بابا کی پنشن کو تو اب ہاتھ بھی نہیں لگانا ہے۔ کچھ تو رہے بہنوں کے لیے۔"

"گھر کے بجٹ میں اب اور کتنی کمی ہو سکتی ہے؟۔ پہلے ہی بہت دیکھ بھال کے خرچ کرتے ہیں۔" آذر سوچتے ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں ہو سکتی؟۔ ہم چلتے دن میں صرف ایک بار پینا شروع کر دیتے ہیں۔ کھانے میں گوشت کا استعمال کم سے کم کر دیتے ہیں۔" عنصر ایک دم سے بول پڑا۔ وہ دونوں چونک اُٹھے۔ لیکن وہ کہتا ہی رہا۔ "اور کم سے کم بھی کیوں۔ آپ لوگ تعاون کریں تو یہ قصہ ہی ختم کر کے مکمل ویجی ٹیرین بنا جا سکتا ہے۔"

آذر مسکرانے لگا۔

"اتنا ظلم بھی نہ کرو یار! دو دفعہ فی ہفتہ ٹھیک رہے گا۔ اور چلو بس اب سو جاؤ۔ بڑوں کی باتوں میں کان نہیں لگاتے۔"

"بڑے جب کام کی باتیں کریں تو کان لگانے میں کیا حرج ہے؟"

"ہے حرج۔ تبھی کہہ رہا ہوں۔ ابھی حالات خدانخواستہ ایسے موڑ پر نہیں آئے کہ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت ہو۔" آذر نے اُسے دوبارہ سونے پر مجبور کیا تو اُس نے بھی آنکھیں موند لیں۔ اور چپ چاپ پڑا رہا۔ آذر دانش کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ان چھوٹے چھوٹے اقدامات سے بات نہیں بنے گی۔ ہمیں ذریعۂ آمدنی بڑھانا ہوگا۔ میرے خیال میں اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں مستقل بنیادوں پر نوکری کرنا شروع کر دوں۔"

"تو پھر پڑھائی کا کیا بنے گا؟"

"اللہ مالک ہے۔ چل سکی تو چلا لوں گا ورنہ چھوڑ دوں گا۔"

"اب اتنی عقلمندی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کُل ڈیڑھ سال رہ گیا ہے۔ ڈگری ملنے میں اور اس طرح سوچنے لگے۔ اتنے سے عرصے میں کون سا فرق پڑ جائے گا۔ دوسرے طریقے بھی تو ہیں آخر۔ کوچنگ سینٹر کی انتظامیہ مجھے بار بار فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کی کلاسز کے لیے آفر کر چکی ہے۔ اُن سے ٹھیک ٹھاک آمدنی ہو جائے گی۔ میرا تو مین سبجیکٹ ہی میتھس ہے۔ بڑی کلاسوں کو پڑھانے سے میری پریکٹس بھی ہو جائے گی۔" دانش نے عزم بھرے لہجے میں کہا۔

"اب پڑھائی کا ذکر بھی مت کیجیے گا۔ امی حلیہ بگاڑ دیں گی۔ ہر ایک کو فخر سے بتاتی ہیں کہ اُن کا بڑا بیٹا انجینئر بن رہا ہے۔"

آذر کچھ نہ بولا۔ عجیب دوراہا تھا یہ بھی۔

آذر کو آج شدت سے بابا یاد آ رہے تھے۔

"کاش آپ نے ہمیں کسی یتیم خانے میں ڈال دیا ہوتا۔" وہ دل ہی دل میں اُن سے مخاطب تھا۔ "وہ ہمیں کسی طرح ٹھکانے لگا دیتے۔ نہ لگاتے تو ہم قسمت پہ شاکر ہو جاتے۔ آج یہ صورت تو نہ پیدا ہوتی۔ ہمیں تو پڑھا لکھا کے یہاں پہنچا دیا اور اپنے بچوں کے لیے کیا بچایا؟۔ ابھی کسی ایک کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی اور ہاتھ خالی ہو گئے۔"

اس نے بے خبر سوئی ہوئی سحر کو دیکھا۔ "جب تک سحر کی باری آتی۔ کتنا ہی جہیز تیار ہو سکتا تھا۔ دانی اور عنصر بھی اپنے پاؤں پہ کھڑے ہوتے۔ ہماری فکر میں ساری جمع پونجی لُٹ گئی۔ اب کیا ہوگا؟" اُس کی آنکھوں کے گوشے پھر گیلے ہونے لگے۔

امی نے چاہا تھا۔ اتنا کچھ جہیز کے نام پر جمع کر دیں کہ لوگوں کی سوال کرتی آنکھوں اور زہر اگلتی زبانوں پر قفل لگ جائیں۔ کوئی ان کا شجرۂ نسب نہ پوچھے۔ کوئی ان کی قومیت اور خاندانی تشخص کے بارے میں استفسار نہ کرے۔ اسی لیے انہوں نے بابا کے پراویڈنٹ فنڈ کا کثیر حصہ بینک سے نکلوا لیا تھا۔ الیکٹرانکس پر ڈیوٹی کم ہونے اور سونے کی قیمت گرنے کا فائدہ اُٹھانا چاہ رہی تھیں وہ۔ انہیں تو موقع نہ مل سکا۔ اُس سے پہلے ہی ڈاکوؤں نے فائدہ اُٹھا لیا۔ ظالم بے درد لوگ۔

"بابا!" وہ سسک پڑی۔

"ذرشی!" اچانک دروازے کی طرف سے امی کی آواز آئی۔ تو اُس نے فوراً سسکیاں دبا لیں۔ "امی! آپ جاگ رہی ہیں ابھی تک؟"

"ہاں، نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوچا دروازے چیک کر لوں۔ لیکن تم کیا کر رہی ہو؟" وہ اُس کے پاس آ گئیں۔ اُسے بغور دیکھا۔

"تم رو رہی تھیں؟" وہ خود پر قابو نہ پا سکی۔

"امی! آپ اتنی کیوں فکر کرتی ہیں۔ جو کچھ قسمت میں ہوتا، جھیل لیتے۔ صرف میرے اور آذرشی کی خاطر آپ نے سب۔۔ بس اب آپ صرف سحر کے لیے سوچیں گی۔ میں مزید حق تلفی نہیں ہونے دوں گی۔ سُن لیا ناں آپ نے؟" وہ سُوجی آنکھوں اور غصّے بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

خیر سے اُس کے پاس بیٹھ گئیں۔ "اچھا تو بیٹی صاحبہ اب بڑی ہو گئی ہیں۔ ماں پہ حکم چلانے لگی ہیں۔ خبردار اگر آئندہ تم نے ایسی باتیں سوچیں!"

"امی! بس کریں اب۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے بہن بھائیوں کی نظر میں مجرم بن جاؤں۔ چڑنے

لگیں وہ ہم دونوں سے۔"

"کیوں اس طرح کے خیالات پالتی ہو۔ دیکھو ذری! ہم نے تمہارے لیے وہی کیا جو ہم سے کروایا گیا۔ اگر نہ بھی کرتے تو تمہارے حصے کا رزق تمہیں ضرور ملتا۔ پھر احسان یا بدلے کا کیا سوال رہتا ہے۔ اور تم نے اپنے بھائیوں کو کب سے اتنا کم ظرف سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایسا مشکل وقت کم ہی پڑا ہے لیکن انشاءاللہ ہم سب اس سے آسانی سے گزر جائیں گے۔"

وہ اُسے دیر تک سمجھاتی رہیں۔ جانتی تھیں ذرش کتنی حساس ہے۔ بوجھ ہلکا نہ ہوا تو سو نہ سکے گی۔

سوئی تو آورش بھی نہ تھی۔ لیکن خاموش تھی۔ اپنی بوکھلاہٹ پر شرمندہ۔ بزدلی سے ناراض آورش، اس وقت تیزی سے منصوبے بنانے میں مصروف تھی۔ ذری نے پورا گھر سنبھال رکھا تھا۔ بہت ہنرمند تھی وہ اور پھر تعلیم بھی ہوم اکنامکس کی تھی۔ آشی اور سحر تو حکم کے غلام تھے۔ اگر اوون کا ایک مکمل سیٹ اُس کے پاس ہوتا۔ یا تمام نئی تیکنیک سے آراستہ سلائی مشین ہوتی تو وہ گھر بیٹھے بھی بہت کچھ کر سکتی تھی۔ آشی کو پورا یقین تھا کہ ذری کو وسائل میسر آجائیں تو وہ اپنے سلیقے اور ہنرمندی کے ذریعے بہت پیسہ کما سکتی تھی۔ سب اُس کی صلاحیت کی گواہی دیتے تھے بس کسی طرح کچھ پیسے مل جاتے۔

"میں کیا کر رہی ہوں آخر؟" یکایک اسے احساس ہوا۔ "کب سے گھر بیٹھی وقت ضائع کر رہی ہوں۔ اب تو اسکولز کھلے بھی مہینہ ہو گیا۔ کہیں اپلائی کرتی تو کیا خبر جاب مل ہی جاتی۔ زیادہ نہیں تو کم ہی سہی کچھ تو پیسے ملتے۔"

"خیر" اُس نے خود کو تسلی دی۔ "ابھی بھی امید ہے۔ کوشش تو کر ہی دیکھوں۔ بس اب کل ہی سے بھاگ دوڑ شروع کر دوں گی۔" اُس نے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش شروع کر دی۔

عجیب رات تھی وہ بھی۔ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ کبھی کسی اندیشے سے آنکھیں کھل جاتیں۔ کبھی کوئی خوف سوار ہو جاتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ اب مدتوں وہ بے فکر نیند آنکھوں تک نہ آسکے گی۔ جس کے ذریعے ہر پریشانی خوبصورت خوابوں کا غلاف اوڑھ لیا کرتی تھی۔

سب کی نظر بچا کے عنفر بھی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ وہ ہر کام، ہر مشکل اور ہر شرارت میں سب کے شانہ بہ شانہ شریک رہا تھا۔ اب کیسے پیچھے رہ جاتا۔

"کچھ تو کرنا ہی ہے۔ ایسا کوئی کام ہو۔ جس میں پابندیٔ وقت کا مسئلہ نہ ہو۔ ورنہ بات چھپائی نہ جا سکے گی۔ اور اگر بات کھل گئی تو شامت آجائے گی۔ رات کی محفل میں شرکت پہ پابندی لگ جائے گی۔"

اُس نے کئی دن اخبارات کی جانچ پڑتال کی۔ اتوار کو "ضرورت ہے" کے کالم میں سر گھسائے بیٹھا رہا۔ پھر بہت سوچ بچار کے بعد جو سب سے مناسب نظر آئی، اُس آسامی کے لیے درخواست بھیج دی اور اب جواب کے انتظار میں محاورتاً نہیں حقیقتاً گھڑیاں گن رہا تھا۔

"بیس، اکیس،" گنتی یہیں تک پہنچی تھی کہ بیل بجی۔ وہ بھاگ کر امی کے کمرے میں پہنچا اور ریسیور اُٹھا لیا۔ "ہیلو۔"

"ہیلو۔ یہ مس آورش نفر کا گھر ہے؟" دوسری طرف سے کوئی خاتون بول رہی تھیں۔

"جی۔ آپ کون؟"

"میں گلیکسی اسکول سے بات کر رہی ہوں۔ ذرا انہیں بلا دیں پلیز۔"

گلیکسی اسکول قریب ہی تھا لیکن آپی؟ عنفر نے اُلجھتے ہوئے ریسیور پہ ہاتھ رکھ کر آشی کو آواز دی۔

آشی لپک کر آئی۔ "کس کا فون ہے؟"

"کوئی گلیکسی اسکول سے۔" آشی نے تیزی سے ریسور اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"جی۔ میں بول رہی ہوں۔ اوہ۔ شکریہ۔ کیوں نہیں ضرور۔ نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ میں ٹھیک نو بجے پہنچ جاؤں گی۔"

اُس نے تیز تیز جملوں میں بات ختم کر کے ریسیور رکھ دیا۔ اور انتہائی سرخوشی کے عالم میں مڑی۔ عنفر حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات تھی آپی؟" اُس نے پوچھ ہی لیا۔

"کچھ نہیں چندا۔ ایک اسکول میں انٹرویو اور ڈیمو (DEMO) دیا تھا۔ مجھے اپروو کر لیا گیا ہے۔" وہ مختصر لفظوں میں اُسے بتاتی کچن کی طرف بھاگی۔ عنفر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"آپی تو چھپی رستم نکلیں۔ میں انتظار کرتے کرتے سوکھ گیا۔ جاب انہوں نے اچک لی۔" وہ بڑبڑاتا ہوا پھر گھڑیاں گننے چلا گیا۔

دانش نے سنبھل سنبھل کے کمرے میں قدم رکھا۔ اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اگرچہ میٹرک کو تو وہ پڑھاتا ہی رہا تھا لیکن یہ سیکنڈ ایئر تھی۔ کئی لڑکے تو دیکھنے میں اُس سے بڑے ہی لگتے تھے۔ انچارج صاحب نے مشورہ دیا کہ شروع سے رعب ڈال دینا۔ پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔" لیکن ان لوہٹا کے لوہٹا پر رعب ڈالنا۔ بذات خود ایک مسئلہ تھا۔ الٹا اپنے ہی پسینے چھوٹے جا رہے تھے۔

اُس کے داخل ہوتے ہی لڑکیاں لڑکے سب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن اس کھڑے ہونے کے دوران آتی گھسیٹا گھسیٹی کی آوازیں سنائی دیں کہ وہ بوکھلا کے رہ گیا۔ پھر خود پر قابو پا کے آواز میں رعب پیدا کر لیا۔

"سٹ ڈاؤن۔"

"تھینک یو سر!" دوبارہ ویسی ہی آوازیں آنے لگیں۔

یا تو کرسیاں تھیں ہی ایسی۔ یا۔ وہ اُسے تنگ کر رہے تھے۔

(بیٹا! ابھی بتاتا ہوں)

وہ ہاتھ باندھ کر انتہائی اسٹائل سے کھڑا ہو گیا۔ ٹانگوں کی لرزش کو بھی قابو کیا۔

"کہتے ہیں" اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ "دنیا میں سب سے ناگوار آواز گدھے کی ہوتی ہے۔ اور اس وقت مجھے آپ کی یہ اٹھا پٹخ سخت ناگوار گزر رہی ہے۔ انسان اور گدھے میں کچھ تو فرق ہونا ہی چاہیے۔ کیا خیال ہے؟" وہ تھوڑا سا جھکا۔ کلاس میں سناٹا چھا گیا۔

دانش مسکراتا ہوا بلیک بورڈ کی طرف مڑ گیا۔

"شاباش ہیرو!" اُس نے دل ہی دل میں اپنی پیٹھ ٹھونکی۔ "اسے کہتے ہیں بُرائی کو شروع میں دبا دینا۔"

وہ کافی دیر تک کیلکولس پر زور بیان صرف کرتا رہا۔ جب مطمئن ہو گیا تو پوچھنے لگا۔

"ٹھیک ہے؟ اوکے۔"

کلاس مکمل طور پر خاموش رہی۔

"کوئی سوال؟"

پھر وہی خاموشی۔

(یا اللہ) "اچھا آپ سمجھ چکے ہیں تو اظہار کر دیں۔ ورنہ بے شک خاموش رہیں۔"

ذرا خاص قسم کا اظہار ہوا۔ "ڈھینچوں۔ ڈھینچوں ڈھینچوں۔"

دانش نے طویل سانس لی۔ (بڑی اونچی چیزوں سے پالا پڑا ہے لیکن میرا نام بھی دانش ہے۔)

"اوکے۔ تو آپ لوگوں کی سمجھ میں آگیا۔ تھینک یو۔" اس نے اگلا ٹاپک شروع کر دیا۔

آورش اسٹاف روم میں میمی کا پیپر چیک کر رہی تھی۔ اُسے ہشتم بی کی کلاس ٹیچر بنایا گیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا اسکول تھا لیکن اصول بہت سخت تھے۔ اُس کی کلاس صرف لڑکوں پر مشتمل تھی۔ شروع شروع میں وہ بہت گھبرائی کہ اتنے لڑکوں کو کس طرح کنٹرول کر سکے گی۔ پرنسپل سے بھی درخواست کی کہ کوئی اور کلاس دے دیں لیکن اُن کے مطابق اس کلاس کی صورت میں آورش کی لاٹری نکل آئی تھی کیونکہ یہ بہت ذہین اور تمیزدار طلبہ پر مشتمل تھی۔ ویسے انہوں نے کچھ غلط نہ کہا تھا۔ ڈھائی تین ہفتوں میں اس نے جو مشاہدہ کیا تھا۔ وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔ اُن کی قابلیت کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ تھا کہ نویں اور دسویں کلاس کے ہوتے ہوئے بھی اسکول کے تمام بڑے عہدے اُن کے پاس تھے۔ ہیڈ پریفیکٹ عاصم اور ہیڈ مانیٹر شہریار دونوں کا تعلق اسی کلاس سے تھا۔ اور عموماً سب طلبہ و طالبات اُن کی برتری تسلیم بھی کرتے تھے۔ سوائے آٹھویں کے۔

اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ بریک کے بعد سب کلاسیں لائنیں بنائے جا رہی تھیں۔

"افوہ! مجھے بھی تو اسمبلی اٹینڈ کرنی تھی۔"

وہ ہڑبڑا اُٹھی لیکن پھر سُست پڑ گئی۔ "اکثر ٹیچرز نہیں جاتیں۔ کیا ہوا جو آج میں نہ گئی۔ یوں بھی اب لائنیں چلنا شروع ہو گئیں۔ پریفیکٹ چیکنگ شروع کر چکے۔ اب میرا کیا کام وہاں۔"

آج صبح سے مسلسل پیریڈز لیے تھے۔ اب تھکان محسوس ہو رہی تھی۔

"آپ رُک جائیں۔" اچانک اُسے عاصم کی آواز آئی۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔

وہ نویں کلاس کے کسی لڑکے کو روک رہا تھا لیکن وہ تو چپکے سے سُنی اَن سُنی کر کے نکلتا چلا گیا۔ اور اُس کے پیچھے آتی ہشتم اے کی لائن ایک جھٹکے سے رُک گئی۔

سب سے آگے فرحانہ تھی۔ کلاس کی تیز ترین لڑکی۔

"کیوں؟ کیوں رُک جائیں؟" اُس نے تیوریاں چڑھائیں۔ "کیا ہمارے شوز گندے ہیں، یا یونیفارم مکمل نہیں ہے؟"

"خوامخواہ کی بحث مت شروع کریں۔ میں نے آپ سے نہیں عثمان سے کہا تھا۔" عاصم جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ اب کوئی غلطی نظر نہیں آئی تو یہی کہو گے۔" فرحانہ کے پیچھے کھڑی سمیعہ طنزیہ انداز میں بولی۔ آشی کی دلچسپی بڑھ گئی۔

اتنے میں رضا اور شاہد بھی آ گئے۔ یہ بھی پریفیکٹس میں سے تھے۔ رضا نے فوراً دخل اندازی کی۔

"کیا ہوا عاصم؟"

"لو۔ آ گئی کمک! اکیلے ہیڈ پریفیکٹ تو کسی کام کے ہیں نہیں۔" ہشتم اے میں سے کسی اور نے گل افشانی کی۔

عاصم چُپ تھا لیکن رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ اُدھر رضا اور شاہد اس کی طرح چُپ ہو جانے والوں میں سے نہ تھے بلکہ شاہد تو بلا کا مقرر تھا۔

"معاف کیجیے گا، حسد کرنے سے سوائے رنگ کالا ہونے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ آپ لوگ کب تک اس غم میں گھلیں گی کہ آپ کی کلاس سے ہیڈز نہیں چُنے گئے۔ جلنے کے بجائے اگر محنت سے کام لیں تو شاید آئندہ سالوں میں کوئی امکان بن ہی جائے۔ ابھی تو آپ کی پریفیکٹس کی کارکردگی کا وہ حال ہے کہ بیان کرنے لگوں تو پورا پیریڈ گزر جائے، حال ختم نہ ہو۔ اُن کی ذمے داری ہے کہ لڑکیوں کی نگرانی کریں۔ اور کیا نگرانی کی ہے انہوں نے کہ فرحانہ کے بُندے مجھے بھی نظر آ رہے ہیں۔ شمائلہ کی چوڑیاں بار بار آستینوں سے جھانک رہی ہیں۔ سمیعہ کے بینڈز کبھی لال ہوتے ہیں، کبھی پیلے پڑ جاتے ہیں۔ آصفہ کی نیل پالش روز نت نئے رنگ بدلتی ہے۔ حمیرا اپنے ناخنوں سے اللہ جانے کس کا خون کریں گی۔ مجھے لگتا ہے ایک دن پرنسپل کو بھی ان سادگی پرستوں کی خبر ہو جائے گی، نہ ہو گی تو بس معصوم بے خبر پریفیکٹس کو۔"

(واہ واہ۔ کیا بات ہے۔ کیا اندازِ خطابت ہے۔ کیا زبان پر عبور ہے۔ شاباش شاہد!)

اندر بیٹھی آشی داد دے رہی تھی۔ اور باہر لڑکیاں رونے والی ہو چکی تھیں۔

"ہم شکایت کریں گے میڈم سے۔ آپ لوگ بدتمیزی کرتے ہیں۔" وہ جلدی جلدی چلنا شروع ہو گئیں۔

"کر دیجیے گا شکایت۔ ہم نے کوئی منہ پر ٹیپ تھوڑی لگا رکھی ہے۔ بتا دیں گے کہ کیا ہوا تھا۔" رضا نے لاپروائی سے کہا۔

اور اندر بیٹھی آشی سر ہلا ہلا کے تائید کر رہی تھی۔ "اور کیا۔ لڑائی تو اُن لوگوں نے شروع کی تھی۔ میری کلاس نے تو بس دفاع کیا ہے۔"

وہ سب کھانے کی میز کے گرد جمع تھے۔ دانش بڑھا چڑھا کے اپنے رعب و دبدبے کی ولولہ انگیز داستان سُنا رہا تھا۔ امی اور ذری بار بار مسکرا پڑتیں لیکن سحر کو اُس کی ہر بات کا یقین تھا۔ وہ بہت متاثر سی شکل بنا کے اُس کا جوش و خروش دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی نظر عنفر پہ بھی جا پڑتی جو اتنے ہی جوش و خروش سے فرمی گولہ لپیٹ رہا تھا۔ جب دانش یہاں پہ پہنچا۔

"اور میں نے اتنی زور سے ڈانٹا کہ وہ رونے لگا۔" عنفر نے اُٹھ کر ساتھ باہر کھڑکی سے باہر جھاڑنا شروع کر دیے۔

"یہ کیا کر رہے ہو عنفر؟" امی نے ٹوکا۔ وہ فرمی پسینہ پونچھتے ہوئے مڑا۔

"امی! بہت ہوائی چھوٹ رہی ہے۔ گولے بنا بنا کے باہر پھینک رہا ہوں۔ تاکہ کمرے میں جگہ نکل سکے۔"

دانش بھنا گیا۔ "بیٹا! مذاق نہیں ہے کہ کالج کلاسز کو پڑھانا۔ تمہارے جلنے سے میرے کام کی اہمیت کم نہیں ہونے کی۔"

"نہ ہو۔ میں خود کام ڈھونڈ لوں گا۔"

"اچھا اچھا۔ تو اب میاں ننھے بھی جاب کریں گے۔ ارے تم گھر پر رہ کے اپیا کا ہاتھ بٹا لیا کرو۔ یہی بڑی بات ہے۔"

"اور کیا؟" ذری مصنوعی سنجیدگی سے بولی۔ "تھوڑا سلیقہ آ جائے گا۔ آخر کو تم نے پرائے گھر جانا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ بہنوں نے کچھ نہیں سکھایا۔"

"ہیں اپیا! کیا واقعی عنفر کو گھر داماد بنوائیں گے؟" دانش پوری بتیسی نکال کر بولا۔

"ظاہر ہے جب نکمے کا نکما رہے گا تو یہی کرنا پڑے گا۔"

آذر ایک دم کرسی کھسکا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سب حیران رہ گئے۔

"آذر! کیا ہوا۔ بیٹھو ناں۔"

"بس امی! بھوک نہیں ہے زیادہ۔" وہ مختصراً کہتا ہوا اندر چلا گیا۔

"پتا نہیں کیا ہو گیا ہے آذر کو؟" ذری سونے لیٹی تو آشی سے ذکر کرنے لگی۔ "بہت چُپ چُپ رہنے لگا ہے۔"

"ہاں۔"

"شاید اُسے یونیورسٹی میں کوئی پرابلم ہے۔"

"ہوں۔ شاید۔"

"کیا ہوں ہاں لگا رکھی ہے۔" ذری چڑ گئی۔ "اور آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ روز تو اسکول کی کوئی نہ کوئی بات ضرور سناتی تھیں۔"

"ہوں۔ کچھ نہیں۔ بس آج تھوڑی تھکن ہو گئی۔" آشی نے جلدی سے کروٹ بدل لی۔ مبادا ذری کچھ جان لے۔

اسکول میں تو آج بہت کچھ ہوا تھا۔ کیا کیا سناتی؟ پہلے اسٹوڈنٹس کی لڑائی۔ پھر پرنسپل سے بات چیت۔ اپنی اپنی جگہ دلچسپ اور تلخ۔

"مس آورش! آپ کو پتا چلا کہ آپ کے اسٹوڈنٹس نے آج کیا حرکت کی؟" کتنا سخت لہجہ تھا اُن کا۔ پہلے وہ ہونق بن کر اُن کی شکل دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ سے منمنانا شروع کیا۔

"میڈم! بات شروع تو ہشتم اے نے ہی کی تھی۔ میں خود اُس وقت اسٹاف روم میں موجود تھی۔ وہ اصل میں یوں ہوا۔"

"میں بچوں کی لڑائی کی بات نہیں کر رہی۔" انہوں نے بات کاٹی۔ "غلطی کسی کی بھی ہو۔ حدود سے آگے کوئی بھی نہیں جا سکتا۔ مجھے پورا قصہ نہیں معلوم۔ نہ مجھے اس سے دلچسپی ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ جب وائس پرنسپل نے انہیں بُلا کر باز پُرس کی تو وہ سب اپنے اپنے بیجز اُتار کے واپس چلے گئے۔ بغیر ایک لفظ کہے۔"

آشی چُپ کی چُپ رہ گئی۔ اُس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ بات اُس سمت بھی جا سکتی ہے۔ وہ تو مزے ہی لیتی رہی۔ اور وہاں ڈسپلن کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ (کاش میں نے دخل اندازی کر کے بات وہیں ختم کرا دی ہوتی)

"اس قسم کا رویہ اس سے پہلے کسی نے بھی نہیں اپنایا۔ یہ تو بہت خاصے ویل مینرڈ ہوا کرتے تھے۔ نہ جانے اب کیا ہو گیا ہے۔ ٹیچرز تو ڈانٹتے ہی ہیں۔ ظاہر ہے مسز تنویر کو غصہ چڑھا ہو گا۔ وہ ہشتم اے کی کلاس ٹیچر بھی تو ہیں۔ اپنی کلاس کو روتا ہوا تو نہیں دیکھ سکتی تھیں جبکہ اس پورے واقعے میں مخالف کلاس ٹیچر بھی بنفسِ نفیس شریک رہی ہوں (یا اللہ! بات کیا سے کیا ہو گئی)۔"

"بائی دا وے۔ میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ آپ بریک کے بعد اسٹاف روم میں کیا کر رہی تھیں؟" (لو ایک

اور حماقت کھل گئی)

وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

"اب آپ جائیں اور آئندہ یہ یاد رکھیے گا کہ کلاس ٹیچرز کا کام بچوں کی حمایت کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ انہیں ڈسپلن سکھانا ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے آپ جلد اپنے رویّے میں تبدیلی لا کر انہیں ویسا ہی ویل بی ہیوڈ بنا دیں گی جیسے۔۔۔ جیسے یہ پہلے تھے۔"

(ہاں۔ جیسے یہ میرے آنے سے پہلے تھے۔)

اور اب وہ رونے جا رہی تھی۔

وہ جانتی تھی۔ اُس سے غلطی سرزد ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک اُسی دور میں گم تھی جو کالج میں گزرا تھا۔ اچانک جاب کا خیال آیا اور فوراً ہی وہ کلاس ٹیچر بن گئی۔ پھر یہ باور کر لیا گیا کہ وہ خود ہی ذمہ داریاں کو سمجھ لے گی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ غلطی دوسروں کی بھی تھی۔

اُسے اپنی کلاس کے اداکاروں پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں پیدا ہوئے اور غصہ تو دیکھو ان کا۔ ویسے۔ وائس پرنسپل نے نہ جانے کس طرح ڈانٹا ہوگا۔ کلاس ٹیچر ہونے کے ناتے وہ غیر جانبدار تو نہیں رہ سکی ہوں گی۔ اس عمر میں تو ویسے بھی لڑکے جذباتی ہوتے ہیں۔ کیا اسٹائل ہے۔ عہدے چھوڑ دیے۔ ٹھیک ہی تو کیا۔ اگر انہیں اہل نہیں سمجھا جا رہا تو کیوں رہیں وہ اس مقام پر؟۔ اگر یہی جذبہ پوری قوم میں بیدار ہو جائے تو ہمارا ملک سنور جائے۔

"حد ہو گئی۔" اُس نے غصے سے کروٹ لی۔ "میں تو پھر ان ہی کو سپورٹ کرنے لگی جن کی وجہ سے اتنی ڈانٹ سننا پڑی۔

یا اللہ۔ اب میں کس طرح اسکول جاؤں اتنی انسلٹ کے بعد۔ ابھی تو صرف دو ہفتے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں آگے کیا ہوگا؟" نوکری کیا ہوتی ہے؟۔ اب پتا چل رہا تھا۔ اب تک تو گھر کے ہنستے مسکراتے ماحول میں رہی تھی۔ کبھی پھول کی چھڑی بھی نہ لگی تھی۔ اور اب ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے بھرے بازار میں جوتے برس گئے۔

"ٹھیک ہے۔ نہ میرے اسٹوڈنٹس اپنے مقام کے اہل۔ نہ میں اس ملازمت کی اہل۔ میں کل ہی استعفیٰ دے دوں گی۔"

وہ فیصلہ کر کے جونہی پلٹی۔ نظر امی پہ جا پڑی۔ اور اُس کا دل ڈوبنے لگا۔

وہ پھر دروازے چیک کر رہی تھیں۔ مہینہ ہونے کو آیا۔ لیکن امی کا خوف ختم نہ ہوا۔ بار بار جاگ جاتیں۔ ایک ایک کمرے، دروازے اور کھڑکیاں جانچتیں۔ ہر بچے کے پاس آ کے دعا پڑھتیں۔ پوری رات ایسے ہی گزر جاتی۔

ڈاکو پراویڈنٹ فنڈ کے ساتھ ان کا سکون بھی لے گئے تھے۔

اُسے اپنا عزم یاد آگیا۔

"اتنی جلدی ہارنے لگیں۔ لوگ کیا کیا نہیں جھیلتے فکرِ معاش میں۔ اور تم کیا موم سے بنی ہو کہ ذرا سی ڈانٹ سے پگھل گئیں۔ تم نے کیا سمجھ رکھا تھا۔ زندگی ہمیشہ یونہی پُرسکون رہے گی۔ امتحان تو آئیں گے۔ اس سے بڑے اور کٹھن بھی۔ برداشت تو کرنا ہی ہوگا۔ اب جذباتیت چھوڑو۔ دل کو پتھر بناؤ۔ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو۔ کلاس ٹیچر کی حیثیت سے بھی اور اس گھر کے فرد کی حیثیت سے بھی۔"

وہ دیر تک خود سے اُلجھتی رہی۔ آخر کار سو گئی۔

"آذر!"

"جی سر!"

"کچھ پریشان ہو؟"

"جی! نہیں تو!"

"تو اتنی دیر سے کمپیوٹر پر کیوں نظریں جمائے بیٹھے ہو؟ کام شروع کرو۔" سر نے ہلکے سے کہا۔ آذر شرمندہ ہو گیا۔

"اوہ سوری سر! میں دراصل یہ سلیوشن تھوڑا گاڑھا کرنا چاہ رہا تھا۔ بہت ملول۔۔۔ ڈل گیا ہے۔" وہ جلدی سے فلاسک اٹھا کر ویکیوم اپریٹس میں فکس کرنے لگا۔ فلاسک ابھی پوری طرح فکس بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے سوئچ آن کر دیا۔ فلاسک گھومنے لگی۔

"آذر! دیکھو۔" سر مرتضیٰ نے چیخ کر کہا تو اُسے ہوش آیا۔ فلاسک پیچھے کی طرف جا رہی تھی۔ جب تک وہ کچھ کرتا۔ وہ نیچے آ رہی۔ اور ٹوٹ گئی۔ سارا سلیوشن زمین پر بکھر گیا۔

آذر بُری طرح اپ سیٹ ہو گیا۔

"اُف میں کبھی کچھ نہیں کر سکتا۔ بے کار، نکما انسان۔"

وہ سر تھام کے وہیں کہنیوں کے بل میز سے ٹک گیا۔

سر مرتضیٰ اپنا کام چھوڑ کر اُس کے پاس آ گئے۔ "اس عمر میں ایسی فضول باتیں کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ چلو۔ پہلے تو یہ سب کچھ صاف کرو۔ پھر میرے پاس آ کے بیٹھو۔"

"اور اب مسئلہ یہ ہے سر!" اُس نے ساری بات انہیں تفصیل سے بتا دی تھی۔ اور اب کہہ رہا تھا۔" کہ مجھے کوئی ایسی جاب نہیں مل رہی۔ جو میں پڑھائی کے ساتھ جاری رکھ سکوں۔ میں نے جہاں جہاں بھی اپلائی کیا مجھے جاب کی آفر ہوئی۔ لیکن فل ٹائم۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ یہی مناسب ہے کہ پڑھائی چھوڑ دوں۔"

"ایسا سوچنا بھی مت۔ تمہارا آخری سال ہے۔ ان وقتی نوکریوں کا کیا بھروسا۔ آج ہے کل نہیں۔ پھر کیا ہوگا۔ صرف ایف ایس سی کی سند پہ کون سی جاب ملے گی تمہیں؟ یہ تین ساڑھے تین سال تو مٹی میں رُل جائیں گے۔ تم پوزیشن کے اُمیدواروں میں سے ہو، وہ بھی جائے گی، تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری فیملی کو بھی تو افسوس ہوگا۔"

"آپ بھی وہی کہہ رہے ہیں جو دانش کہتا ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ مجھ سے چھوٹے تو محنت کریں اور میں بیٹھا کھاؤں۔ یونیورسٹی کا کچھ صحیح بھی تو نہیں۔ ایک سال ختم ہوتے ہوتے دو سال بھی لگ سکتے ہیں میں اتنے دن تک صبر نہیں کر سکتا۔"

"تم نے کوچنگ کے لیے کیوں کوشش نہیں کی؟"

"کی تھی میں نے۔ لیکن میرا سلیکشن نہیں ہوا۔ مجھ میں لیکچررشپ کی صلاحیت ہے ہی نہیں۔ نویں اور دسویں میں تو کام چلا لیتا ہوں۔ لیکن اُس سے بہت کم آمدنی ہوتی ہے۔۔۔ دانش میں بھرپور ٹیلنٹ ہے۔ وہ کر لیتا ہے سب کو ہینڈل۔"

"اسی وجہ سے تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ لیکچررشپ تمہاری فیلڈ ہی کب ہے جو اس کا غم لیے بیٹھے ہو۔ تم چھوڑو اس کو، میرے پاس ایک آفر ہے اگر تم چاہو تو۔ ایسا ہے کہ آج کل مجھے ایک پروجیکٹ کے لیے کہا جا رہا ہے، جسے دو سال کے اندر اندر مکمل کرانا ہے۔ اب میرے پاس تو پہلے ہی سے ایک نامکمل پروجیکٹ موجود ہے۔ نیا کیسے لے لوں؟ تم مان جاؤ تو تمہارا نام اسسٹنٹ کے طور پر دے کر میں یہ پروجیکٹ سائن کر لیتا ہوں۔ تم اپنی تھیسس کے ساتھ اس پر بھی کام کرنا شروع کر دو۔ اس طرح تیس ہزار روپے ماہانہ تمہیں تو مل ہی جائیں گے۔ پھر ایک سال بعد جب تمہاری پڑھائی مکمل ہو جائے گی، تو ڈگری کے بل پر یہی رقم دگنی ہو جائے گی۔ زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ شروع میں اتنی بری تو نہیں۔ پھر تمہیں مہارت بھی تو حاصل ہوگی۔ جب پروجیکٹ مکمل ہوگا تو تم ڈگری یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ تجربے کار بھی کہلاؤ گے۔"

آذر کا چہرہ کھل اُٹھا۔ "یہ تو بہترین حل ہے لیکن کیا مجھے یہ پروجیکٹ مل جائے گا؟"

"کیوں نہیں، اچھے طالب علموں کے لیے گنجائش نکل ہی آتی ہے۔" اُنہوں نے اس کے شانے کو تھپتھپایا۔ "مشورہ لے لیا کرو یار۔"

وہ بے دلی سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی اسکول میں داخل ہوئی، اسمبلی شروع ہونے کو تھی۔ یونہی اُس نے اطراف میں نظر ڈالی۔ کچھ عجیب سی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ "اچھا ہاں۔ ایک ساتھ چار پانچ پریفیکٹ اپنی جگہ پر موجود نہ تھے۔ کیا دیدہ دلیری ہے۔ کیا عزم مسلسل ہے۔ فیصلے پر قائم و دائم۔" اتنا نہ ہوا کہ بے چاری کلاس ٹیچر سے بھی کچھ مشورہ لے لیا جاتا۔ ویسے تو ٹیچر ٹیچر کی گردان سے ہونٹ سوکھے جاتے ہیں

اسمبلی ختم ہو گئی تھی۔ اب کلاس میں بھی جانا پڑے گا۔ ان کی شکلیں بھی دیکھنی پڑیں گی۔ بات بھی کرنی ہوگی،

وہ کلاس میں آئی اور بغیر کچھ کہے اٹینڈنس لینے لگی۔

پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ صرف پریفیکٹ ہی نہیں مانیٹرز بھی اُن کی تقلید میں زبیج واپس کیے بیٹھے تھے۔

(واہ بھئی کیا ہم آہنگی ہے۔ آؤٹ سائیڈرز تو صرف میں ہوں)

ہیڈ مانیٹر شہر یار غیر حاضر طلبہ کی تعداد بتانا چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ ان سنی کر گئی جب زبیج نہیں تو مانیٹری کس بات کی؟

وہ سائنس کی ٹیچر تھی۔ اگلے ہفتے اُسے طلبہ کو لیب میں بھی لے جانا تھا۔ تاکہ اُن کی کتاب میں موجود تجربے کر کے دکھا سکے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی، وہ پہلے بھی جاتے رہے تھے۔

آج اس نے اسی موضوع سے متعلق کچھ ہدایتیں دینی تھیں۔ ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ رضا بول پڑے۔

"ٹیچر! ہماری کچھ تجاویز ہیں لیب کے لیے۔"

وہ متوجہ ہوئی تو یکے بعد دیگرے سب بولنے لگے۔

"ٹیچر! ایک تو لیب کی ساری میزیں دیوار کے ساتھ ہونی چاہئیں تاکہ جگہ نکل سکے۔" یہ عاصم تھے۔

"دوسرے وہاں اے۔ سی ہونا چاہیے۔ تاکہ گرمی نہ لگے۔" یہ سمیع تھے۔ سابقہ مانیٹر۔

"اور ٹیچر۔"

"اور ٹیچر۔"

وہ سب بولتے رہے۔ وہ سُنتی رہی۔ جب خاموش ہوئے تو ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہنے لگی۔

"آپ لوگوں کی تجاویز اچھی ہیں۔ لیکن افسوس میں انہیں پرنسپل تک نہیں پہنچا سکتی۔"

"لیکن کیوں ٹیچر؟"

وہ مجسم احتجاج بن گئے۔

"کیونکہ یہ تجاویز مجھ تک بذریعہ چینل نہیں پہنچے۔ آپ کو پتا ہوگا۔ ہر کام کا ایک قاعدہ، ایک نظام ہوتا ہے۔ ٹیچرز میں کلاس ٹیچر کو الگ مقام حاصل ہوتا ہے۔ کلاس میں مانیٹرز کا الگ مقام ہوتا ہے۔ وہ کلاس کی بات کلاس ٹیچر تک پہنچاتے ہیں۔ کلاس ٹیچر وہ بات پرنسپل تک پہنچاتی ہے۔ اور اس طرح بات آگے بڑھتی جاتی ہے۔

"آپ نے تو پہلا مرحلہ ہی توڑ دیا۔ اپنی نمائندگی ہی ختم کر ڈالی۔ کلاس میں بھی اور اسکول میں بھی۔ پھر بات آگے کیسے پہنچے گی؟ اپنی اہمیت خود ہی ختم کر دی تو اور کوئی کیوں اہمیت دے گا؟ سب سے بڑھ کر میں کیوں اہمیت دوں، جبکہ آپ لوگوں نے مجھ سے کچھ پوچھنے، مجھے کچھ بتانے کی زحمت۔۔"

وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ کلاس میں بالکل خاموشی تھی۔ کوئی شرمندگی نہیں، کوئی سوری ٹیچر کی صدا نہیں۔ وہ چُپ ضرور تھے۔ لیکن اُن کے کسی طرزِ عمل سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ کہ ان باتوں کا کوئی اثر ہوا ہے۔

(ٹھیک ہے، بے حسو! بے مہرو! اب میں ایک لفظ نہ کہوں گی۔ مجھے تو نوکری کرنی ہے۔ غلام ہوں میں۔ جو بھی میڈم کہیں گی وہی کہہ دوں گی۔ کوئی جذبات ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہیں کیا یہ؟ بارہ تیرہ سال کے بچے ہونہہ)

اُس نے دوبارہ بلیک بورڈ کی طرف رجوع کر لیا۔

وہ پورا دن ڈسٹرب رہی۔ استعفیٰ کا خیال پھر زندہ ہونے لگا۔ پرسوں اتوار تھا۔ سوچ رہی تھی اخبار پر نظر ماروں گی، کیا پتا کسی اور اسکول میں جگہ خالی ہو۔

آج ہاف ڈے تھا۔ بریک کے بعد جمعہ کی تعظیم میں حمد پڑھی جاتی تھی۔ پھر چھٹی ہو جاتی تھی۔

کل کی ڈانٹ یاد تھی۔ اس لیے بریک ختم ہوتے ہی وہ لان میں جا کے کھڑی ہو گئی۔ آہستہ آہستہ لائنیں بننا شروع ہو گئیں۔ حمد پڑھی جانے لگی۔

پیار بھرا ہر ایک اشارا
پیارا اُس کا ہر نظارا
جس نے زمیں پر پیار اُتارا
وہ خود ہوگا کتنا پیارا

بچے آنکھیں بند کیے پڑھتے جا رہے تھے وہ راؤنڈ لیتی ہوئی اپنی کلاس کی پچھلی سائیڈ پر آ گئی۔

پیار کا اُس کے نہیں شمار
اللہ ہے بس پیار ہی پیار

وہ تھوڑا اور پیچھے چلی گئی۔ ایسے ہی بلا مقصد

پھول بنائے پیارے پیارے

یہ جانی پہچانی سی آواز کہاں سے آئی؟ اُس نے چونک کے دیکھا۔

تتلی، جگنو اور فوارے

عاصم اپنی جگہ پر موجود تھا۔ زبیج اُس کے شانوں پر ایستادہ تھے۔

جگمگ کرتے چاند اور تارے

تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر رضا، شاہد، حسان سب موجود تھے، اپنی اپنی مخصوص پوزیشنز پر مخصوص بیجز کے ساتھ۔

کیا کیا جتن کرنے پڑے ہوں گے انہیں دوبارہ حاصل کرنے کو؟ کس کس سے معافی مانگی ہوگی؟ پتا نہیں کتنی ڈانٹ سنی ہوگی؟ کس طرح مان گئے یہ خود بخود؟ کس کی خاطر؟

۔۔۔۔۔۔ یہ سب ہیں تمہارے

اُس کی آنکھیں مسرت سے دمکنے لگیں۔ شاید ایک آدھ آنسو بھی لڑھک آیا تھا۔

وہ سب کن اکھیوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ جب اُس نے دیکھا تو جلدی سے آنکھیں میچ لیں۔

بچے تو ہر دور کے ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ ادب کرنے والے، محبت کرنے والے، چاند ستاروں، پھولوں، تتلیوں اور جگنوؤں جیسے۔

بس انداز تربیت وقت اور شخصیت کے لحاظ سے بدلنا پڑتا ہے۔ کسی کے لیے سختی کی ضرورت پڑتی ہے۔ کسی کو دلائل سے قائل کیا جاتا ہے، اور کسی کے لیے ہلکی سی چوٹ کافی ہوتی ہے۔ اُس وقت جب لوہا گرم ہو۔ نیت پُر خلوص ہو تو مسئلے سلجھ ہی جاتے ہیں۔ تدبیر سوجھ ہی جاتی ہے۔ نمٹنا آ ہی جاتا ہے۔ وہ بیٹھا ہے ناں اوپر۔ ہر مشکل آسان کرنے والا۔

پیار کا اُس کے نہیں شمار
اللہ ہے بس پیار ہی پیار

"عنصر! کہاں ہو بھئی؟" سحر اسے پکارتی ہوئی اِدھر ہی چلی آ رہی تھی۔

"ضرور اس لڑکی نے بازار بھجوانا ہوگا۔" وہ وہیں قالین پہ لیٹ کے سوتا بن گیا۔

سحر اندر آئی تو ٹھٹھک گئی۔ "اوہ! یہ تو سو رہا ہے۔ چلو امی کو دے آتی ہوں، وہی پوچھیں گی۔" وہ واپس جانے لگی۔

عنصر کے کان کھڑے ہو گئے۔ فوراً اُٹھ بیٹھا۔

"کیا۔ کیا دے آتی ہوں؟ کیا پوچھیں گی؟"

"اچھا تو تم جاگ رہے تھے، پھر سونے کی اداکاری کیوں کر رہے تھے؟"

"یہ بحث چھوڑو۔ پہلے میری بات۔ ارے!" کہتے کہتے عنصر کی نظر سحر کے ہاتھ میں موجود لفافے پہ پڑی۔ دوسرے ہی لمحے وہ چھلانگ مار کر سحر کے سر پر پہنچ گیا۔ اور لفافہ اُچک لیا۔

"مسٹر عنصر شیخ کے لیے۔"

اُس نے باآواز بلند پڑھا۔ اور لفافہ کھولنے لگا۔

"یاہو۔ یہ ہوئی ناں بات۔ اب دیکھے گی دنیا مسٹر عنصر کو، مجھے میاں ننھے کہنے والے خود میاں چُنوں بن جائیں گے۔" وہ خوشی سے کمرے میں چکر کھاتا پھر رہا تھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟ کیا ہو گیا؟ کیا لکھا ہے جو یوں حواس کھوئے دے رہے ہو؟" سحر نے جھپٹ کے کاغذ عنصر کے ہاتھ سے لیا اور پڑھنے لگی۔ پھر بے ساختہ ہنس پڑی۔

"کیوں؟ اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟" عنصر تیوریاں چڑھا کے بولا۔ "جل گئیں؟ ہے نا؟ میں اپنے پیروں پہ کھڑا جو ہونے والا ہوں۔"

"ضرور کھڑے ہو۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں جتنا کھڑے ہونا ہے۔ ابھی ہو لو۔ بعد میں تو اللہ جانے کلاسٹس اس قابل چھوڑیں نہ چھوڑیں بھائی! کیوں اپنی ننھی سی جان کے پیچھے پڑے ہو؟ ذرا اپنی صحت دیکھو اور یہ کام دیکھو۔"

"میری صحت میں کیا خرابی ہے؟ اچھا بھلا ہٹا کٹا ہوں۔"

"ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔" سحر نے چاروں طرف

سے گھوم پھر کے اُس کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔
"مجموعی طور پر تو تم واقعی ہٹے کٹے ہو، لیکن اس نوکری کے لیے تمہیں خود کو "ہائے پارٹس" جانچنا ہو گا۔ مثال کے طور پر تمہاری ٹانگیں۔ کیا برا وقت آنے پر کلائنٹ سے تیز بھاگ سکیں گی؟ پھر تمہاری چرب زبان۔ کیا سو میں سے کسی ایک کا بھی دل پگھلا سکے گی؟ پھر تمہاری گردن، کہیں ہر ایرے غیرے کے ہاتھوں میں تو فٹ نہیں آجائے گی؟ پھر تمہارے کان۔ کیا ہر جلی کٹی آسانی سے جھیل سکیں گے؟ دیکھوں تو۔" اس نے عنصر کے کانوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو وہ بدک گیا۔

"پیچھے ہٹو۔ گندی کہیں کی، ابھی سے اتنا دہلا رہی ہو۔ ابھی تو میں نے کام شروع بھی نہیں کیا۔"
"میری مانو تو یہ مذاق چھوڑ دو بھائی! یہ بہت صبر آزما کام ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ "صبر کی میرے پاس کمی نہیں۔ آخر اتنے بہن بھائیوں کی ڈانٹیں سن سن کر بڑا ہوا ہوں۔ بس تم میرے ساتھ تعاون کرو، کسی کو پتا نہ لگنے دینا۔ میرے راز کو راز ہی رکھنا۔" وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔
سحر سوچ میں پڑ گئی۔
"چلو ٹھیک ہے۔" اس نے بالآخر کہا۔ "مگر ایک شرط ہے۔ جب کامیاب ہونے لگے تو مجھے بھی کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ شریک کر لینا۔ میں اپنی سہیلیوں کو پٹانے کی کوشش کروں گی۔"
"منظور۔" عنصر نے جوش سے کہا۔ معاہدہ طے پا گیا۔

دانش نے بہت اعتماد سے بلیک بورڈ پر لکھا۔ "VECTORS"
"یہ ذرا مشکل ٹاپک ہے۔" اس نے تمہید باندھی۔ "لیکن مجھے امید ہے آپ اس کو سمجھ لیں گے تو آسان لگے گا۔"

وہی جواب تھا۔ مکمل خاموشی!
اس نے مزید کچھ کہے بغیر سمجھانا شروع کر دیا اب وہ اس بات کو لفٹ نہیں کراتا تھا۔ اتنے دن ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے اور کلاس کے باہمی تعلقات روز اول کی طرح کشیدہ تھے۔ وہ سوال سمجھاتا رہتا تھا۔ وقتاً فوقتاً ان سے پوچھتا رہتا تھا۔ "سمجھ میں آگیا اوکے؟ ٹھیک؟" ہر بات کے جواب میں وہی فضول گدھے کی آواز سنائی دیتی۔ اور وہ دوبارہ کام سے لگ جاتا۔
(ان کی مادری زبان ہی یہی ہے تو میں کیا کروں؟ سگنل مل گیا۔ کافی ہے۔)
اپنے پڑھانے سے وہ بالکل مطمئن تھا۔ اگر وہ اچھا استاد نہ ہوتا تو بات انچارج صاحب تک ضرور پہنچ چکی ہوتی، پھر اس کی شہرت کا تو یہ عالم تھا کہ جن کلاسوں کو وہ نہیں پڑھاتا تھا۔ ان میں سے بھی کچھ اسٹوڈنٹس اس کے پاس دوڑ دوڑ کے پڑھنے چلے آتے تھے۔ باقی بھاگ بھاگ کے پڑھنے چلی آتی تھیں" دانش کی دسوں گھی میں تھیں۔ پھر خواہ مخواہ ان بدتمیزوں کی فکر میں کیوں جان ہلکان کرتا۔ رہیں گدھے کے گدھے۔

اس نے بڑی محنت سے چیپٹر کا تعارف مکمل کیا۔ پھر پہلی مشق کا ایک سوال سمجھایا۔ اس کے بعد حسب عادت کلاس پر طائرانہ نظر ڈالی۔
"اوکے؟"
آج کچھ زیادہ ہی خاموشی محسوس ہوئی۔ ڈھینچوں ڈھینچوں کا سگنل بھی نہ ملا۔
(لگتا ہے۔ یہ ٹاپک ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔)
اس نے دوبارہ سمجھانا شروع کیا۔ تمام سابقہ مراحل سے گزر کے پھر پوچھا۔
"کوئی پرابلم؟"
وہی عالم سکوت!
آج تو وہ ڈھینچوں ڈھینچوں بہت یاد آرہی تھی۔
(کیا ہو گیا ہے؟ اتنا بھی مشکل نہیں۔) اس نے تھک ہار کے چاک دوبارہ گھسیٹنا شروع کیا۔
"اب تو سمجھ میں آگیا ناں۔"
سب بے سود! وہ مانوس۔ واحد رابطہ تعلقات باہمی، یعنی آوازِ خر کانوں میں آنی تھی نہ آئی۔ وہ چڑ

گیا۔
"ایسی کیا بات ہے اس سوال میں۔ آپ لوگوں کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا؟ آج آپ لوگوں کو بولنا ہی پڑے گا، بتائیے کون سا اسٹیپ سمجھ میں نہیں آیا؟"
(آج فیصلہ ہو ہی جائے)
تھوڑی دیر تک کوئی نہ بولا۔ پھر ایک لڑکا جھجکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔
"بات یہ ہے سر!" وہ کمال معصومیت سے کہہ رہا تھا "کہ ہم لوگوں کو پہلی دفعہ ہی میں سمجھ میں آگیا تھا۔ لیکن وہ جو ہے نا ہماری کلاس کا گدھا۔ وہ آج غیر حاضر ہے۔"
(ہائے ظالموں! کاش کہ ایک تلوار ہوتی میرے پاس۔ اور میں قتل عام۔)
وہ تھوڑی دیر تک ہونٹ چباتا رہا۔ پھر ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہونے لگی۔
(اصولِ انچارج گئے جہنم میں۔ اب چلیں گے قوانینِ دانش)
اس نے چاک پھینکی اور ہاتھ جھاڑتا ہوا میز پہ چڑھ کے بیٹھ گیا۔
"اچھا بابا! آج میں نے ہی ہار مانی! آؤ اب دوستی کر لیں۔"

"وہ جو کہا تھا ناں میرا جی نے
نگری نگری پھرا مسافر
گھر کا رستہ بھول گیا
تو وہی حال آج ہے تمہارا۔ اور یہ پہنچا کرو بغیر اطلاع کے۔"
وہ جب سے اسٹیشن سے باہر آیا تھا۔ مستقل اپنے آپ پر جھلا رہا تھا۔ اب تو کافی دیر ہو گئی تھی اس شغل کو۔
"محلہ اور گلی تو شاید یہی ہے۔ لیکن مکان کا نمبر۔ اُفوہ! یقیناً شہیر کی بچی نے ہی فون اینچیج کر رکھا ہو گا۔ سہیلیاں تو ہر جگہ ٹھوک کے حساب سے مل جاتی ہیں اُسے۔ مگر آج کل تو شاید کال کا وقت بھی محدود ہو گیا ہے تو پھر۔ شاید فون ہی خراب ہو۔ جو کہیں سے بھی لائن نہ مل سکی۔"
جن دنوں شفٹنگ عمل میں لائی گئی تھی۔ ان دنوں اسے چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ پھر بعد میں ملی تو وہ بھی چند دنوں کی۔ اس لیے اس نے ساری چھٹیاں جمع کر کے ایک ساتھ تیس دنوں کی رخصت حاصل کر لی تھی۔ پورے آٹھ ماہ بعد۔ اور یہاں آکے یہ ہوا کہ مکان کا پتا ہی ذہن سے نکل گیا۔
"چلو میاں شاہ زر الہیٰ! اور کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ اجنبیوں سے اپنے گھر کا راستہ پوچھیں۔" وہ تھک ہار کے رک گیا۔ پاس سے ایک لڑکا گزر رہا تھا۔ اسی کو آواز دے ڈالی۔
"بات سننا!"
"جی!" وہ لڑکا تو شاید بلاوے کا منتظر ہی تھا۔ انتہائی فرمانبرداری سے کھڑا ہو گیا۔
"یہ۔ آس پاس کسی منظر الہیٰ کا گھر ہے؟"
(اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ (یہ تو اب کہہ نہیں سکتا تھا کہ میرے والد صاحب کا گھر ہے یہاں پر؟)

"تنہا مسافر" کے بعد
ذوالقرنین کا دوسرا ناول
جب وہ چومے پتھر کو
شائع ہو گیا ہے
قیمت 45/- روپے
ڈاک خرچ 16/- روپے
منگوانے کا پتا:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار کراچی

لڑکا سوچ میں پڑ گیا۔

"منظر الٰہی۔ نام تو جانا پہچانا ہے۔ لیکن کیا پتا مجھے مغالطہ ہو رہا ہو۔ ایسا کرتے ہیں کہ میں آپ کو کچھ اشارے دیتا ہوں۔ پھر آپ مجھے کچھ اشارے دیجیے گا۔ اگر دونوں کے تیر نشانے پر بیٹھے تو سمجھیں آپ کا مسئلہ حل۔" وہ اتنی تیزی سے بول رہا تھا کہ شاہ زر کو آدھی بات سمجھ میں آئی آدھی نہیں۔

"ہاں۔ تو یہ منظر الٰہی یہیں پاکستان میں رہتے ہیں؟"

"نہیں۔ امارات میں ہوتے ہیں۔"

"اچھا۔ اُن کے بچے کتنے ہیں؟"

"چار۔ پانچ۔"

"کمال ہے۔ یعنی آپ کو تعداد کا۔ خیر اُن کا گھر ہے کیسا؟"

"خاصا بڑا ہے۔ شاید قدیم طرز کا۔"

"بیک ڈور ہوگا؟"

"ہونا تو چاہیے۔"

"فون؟"

"ہاں!"

"ٹی وی؟"

"ہاں۔ لیکن!"

"فریزر؟ فریج؟ ڈش؟ چیک بک؟" وہ تابڑ توڑ پوچھتا جا رہا تھا۔

"بھئی، سب ہے۔ لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟" شاہ زر تنگ آ کے بولا۔

اور اُس نے انتہائی معصومیت سے جواب دیا تھا۔

"اس سے بھی اہم ایک اور سوال ہے۔ جو آپ کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ آپ میری ہر بات کا جواب کیوں دے رہے ہیں؟"

"اُف!" شاہ زر تلملاتا ہوا مڑا۔ اور واپس چل پڑا۔ "ناممکن۔ میں دوبارہ سرگودھا جا رہا ہوں۔ یہ شہر ہی سرے سے غلط ہے۔ امی نے کہیں اور گھر لیا ہے یہاں؟ جہاں ایسے ایسے چکر باز رہتے ہیں؟ نیور۔"

"ارے بھائی صاحب! بات تو سنیں!" لڑکا بھاگا چلا آ رہا تھا۔ شاہ زر کو مجبوراً رُکنا پڑا۔ اُس نے بڑے پیار سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ تو ناراض ہی ہو گئے۔ حالانکہ میں بہت سنجیدگی سے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اصل میں شہر کے حالات بہت خراب ہیں۔ لوگ پورے گھر کا سراغ لگاتے ہیں۔ اُس کے بعد ڈاکہ ڈال دیتے ہیں۔"

شاہ زر کو احساس ہوا کہ وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ واقعی اپنی بوکھلاہٹ میں اُس نے پوری تفصیل بتا دی تھی۔

"اب ذرا سوچیں۔ میں آپ کا پیچھا کروں، گھر کا پتا لگاؤں۔ اور کل پہنچ جاؤں۔ چار پانچ ساتھیوں سمیت تو۔۔؟" اُس نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

شاہ زر نے بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ اب تو اُسے بھی گھبراہٹ ہونے لگی۔ "کیا ضرورت تھی یہاں شفٹ ہونے کی۔" اُسے پھر غصہ آنے لگا۔ اوپر سے یہ لڑکا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں تو صرف ایک بات کہہ رہا ہوں۔ مگر یہ بات بعید از قیاس تو نہیں ہے ناں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

شاہ زر بے چارہ کیا خیال ظاہر کرتا۔ عجیب مصیبت میں پڑ گیا تھا۔

"دیکھیے۔ کوئی آپ نے جان بوجھ کر تو یہ سب بتایا نہیں۔ آخر آپ انسان ہیں۔ انسان سے غلطی تو ہوتی رہتی ہے، کوئی نہیں جانتا کہ اُس سے کب کیا بھول ہو جائے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟"

"جی!" اُس نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔

"اس لیے ایک مشہور مفکر، وہ کیا نام تھا۔ بہرحال اُس نے کہا ہے کہ انسان کو زندگی میں ہمیشہ غلطیوں، اتفاقات اور حادثات کے لیے گنجائش رکھنی چاہیے۔ اور ایسے ہی غیر متوقع حادثات و واقعات سے نمٹنے کے لیے ہم مختلف اسکیمیں لیے پھرتے ہیں۔ اور لوگوں سے اُلٹا باتیں بھی سنتے ہیں۔ کتنی افسوس کی بات ہے نا؟"

شاہ زر نے دانت پیس کر سر ہلایا۔ "بالکل ہے لیکن پلیز اب ذرا جلدی سے یہ بتا دیں کہ آخر آپ

چاہتے کیا ہیں؟"

"میں؟" لڑکے نے بڑے انداز سے توقف کیا۔ پھر جیب سے ایک فارم نکالا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ۔۔"

"کہ آپ انشورنس کروا لیں!"

وہ غراتا، ہونٹ کاٹتا، پیر پٹختا ہوا پھر چل پڑا۔

"دیکھیں۔ بات سنیں۔ اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔ اچھا نہ کرائیں۔ لیکن وہ منظر الٰہی۔ ایک ہمارے گھر کے پاس بھی رہتے ہیں۔ سنیں تو!" پیچھے سے صدائیں آ رہی تھیں۔ لیکن وہ رُکے بغیر سیدھا ایک فون بوتھ تک پہنچا۔ اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ شکر ہے اس دفعہ لائن مل ہی گئی۔

اُن لوگوں نے مشکلات پر تو خاصا قابو پا لیا تھا۔ لیکن اس کے نتیجے میں وہ پہلے والی مسرتیں کھو گئی تھیں۔ اب نہ وہ شام کی محفلیں تھیں۔ نہ لڑائیاں تھیں۔ نہ کھیل تھے نہ فرصت تھی۔ دانش سینٹر سے رات کے نو بجے گھر لوٹتا تو اُسے بستر سے زیادہ لطف اور کہیں نہ ملتا۔ آذر پروجیکٹ کے سلسلے میں کیمپس اور ہوسٹل میں ہی وقت گزار دیتا۔ اُس کی تو شکل بھی دنوں کے وقفے سے نظر آتی تھی۔ آشی اسکول سے واپس آتی تو ساتھ کاپیوں کے پلندے بھی چلے آتے۔ زری ہوتی تو گھر میں ہی۔ لیکن ڈھیروں کام اُسے سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہ دیتے۔ وہ آشی والے کاروباری منصوبے تو ہوائی قلعے ہی ثابت ہوئے تھے۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ ایک بہترین سلائی مشین آ گئی تھی۔ اور آشی ہی کی وساطت سے زری کو کئی ایسی شاگردیں مل گئی تھیں۔ جو روزانہ اُس سے سلائی سیکھنے آتی تھیں۔ پھر گھر کا کام بھی ہوتا۔

رہ گئے سحر اور عنصر تو اُن کے میٹرک اور انٹر کے امتحان آہستہ آہستہ قریب آ رہے تھے۔ پڑھائی سے فارغ ہو کر سحر تو زری کا ہاتھ بٹاتی۔ جبکہ عنصر نہ جانے کن بکھیڑوں میں اُلجھا رہتا۔

وہ پہلے جیسی بے فکری اب کہاں میسر ہو پاتی۔ لیکن یہ تھا کہ اب بھی وہ رات کے کھانے پر ملتے تھے اور اپنے اپنے تجربات بیان کرتے رہتے تھے۔

آج زری اور آشی کو بہت دنوں بعد ہی کچھ مل بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ سو اُن کی باتیں تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نہ آ رہی تھیں۔ وہ آنگن میں بیٹھی نہ جانے کہاں کہاں کے قصے ڈسکس کرنے میں مصروف تھیں کہ اچانک زری کی نظر سامنے دیوار پر پڑی۔ وہ رُک گئی۔ شمسہ کسی نہ کسی طرح دیوار سے لگی بڑی دلچسپی سے اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔ اُسے متوجہ دیکھا تو جھٹ سلام کر دیا۔

"کبھی آئیں ناں ہمارے گھر بھی۔" آج تو خاصے موڈ میں تھی۔

"تم بھی تو نہیں آئیں کبھی!" زری نے مسکرا کر کہا۔

"میں تو مجبور ہو جاتی ہوں۔ گھر میں کوئی ہوتا جو نہیں۔ پھر امی اکیلی ہو جاتی ہیں۔"

"کیوں؟"

زری نے چونک کر کہا۔ "تمہاری باجی جو ہیں عنبر۔"

"ہاں۔ ہیں تو۔ مگر یہاں نہیں ہوتیں۔"

"اچھا۔ اچھا۔" زری سمجھ گئی، ظاہر ہے شمسہ سے بڑی تھیں تو شادی شدہ ہی ہوں گی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم آتے ہیں آج تمہارے ہاں۔" زری فیصلہ کر کے ایکدم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ کیا؟" آشی نے دبی زبان سے کہا۔ "یاد نہیں کس طرح ملی تھیں اس کی امی؟ اُکھڑے اُکھڑے انداز میں۔"

"یار! وہ مجھے مغرور نہیں لگی تھیں بس اپنے آپ میں گم، چپ چاپ رہنے والی محسوس ہوتی تھیں۔ ویسے بھی اگر ایسا تھا تو اس میں بے چاری شمسہ کا کیا قصور۔ پڑوس میں ہو کر اتنا الگ تھلگ رہنا اچھا نہیں لگتا۔ چلو اُس سے دوستی بڑھاتے ہیں۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں اس کے گھر موجود تھیں۔ وہ بہت خوش لگ رہی تھی بسلسل چہک رہی تھی۔ "وعدہ کریں، اب آتی جاتی رہیں گی۔ پتہ نہیں اکیلے اتنا بور ہوتی ہوں۔ بس بابر کے ساتھ اُس کے مشغلوں میں لگی رہتی ہوں۔ امی تو بہت کم آمیز ہیں۔ اتنی تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو بہت چڑچڑی ہو جاتی ہوں۔"

وہ شاید صفائیاں پیش کر رہی تھی اپنے سابقہ کارناموں کی۔ زری اور آشی مسکراہٹ دبا کر رہ گئیں۔

ان کا گھر بھی اگرچہ پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ لیکن چونکہ ذاتی ملکیت تھا۔ اس لیے بہت بہتر حالت میں تھا۔ کنسٹرکشن کا کام ہوتے تو انہوں نے خود بھی دیکھا تھا۔ خاصی رقم خرچ کی گئی تھی۔ وہ گھوم پھر کر پورا جائزہ لے رہی تھیں۔

ایک کمرے میں لگی تصویر نے آشی کی توجہ کھینچ لی تھی۔

"شہیر! یہ کون ہے!" اُس نے ہلکے سے پوچھا۔ زری بھی دیکھنے لگی۔ کچھ جانی پہچانی سی تھی۔

"ارے بھئی۔ میرا سوٹ کیس کہاں چلا گیا؟ اب ضرور کسی جن سے ٹاکرا ہو گا۔ رکھے رکھے تو غائب ہو نہیں سکتا۔"

جھنجلائے ہوئے انداز میں کہتا ہوا ایک اسمارٹ سا بندہ تیزی سے کمرے میں گھس آیا۔ پھر ایک لمحے کو تو چکرا ہی گیا۔ اُس کے بعد اتنی ہی تیزی سے مڑ گیا۔

شہیر سر کھجانے لگی۔ "یہ بھائی جی ہیں۔ تین دن پہلے ہی آئے ہیں۔ آتے ہی جانے کس انشورنس ایجنٹ سے ٹکرا گئے۔ بس تب سے لگے ہیں کہ یہ محلہ ہی چھوڑ دینا چاہیے۔"

"ہو سکتا ہے کسی نے یونہی چھیڑا ہو۔" زری نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں۔ بقول بھائی اُس نے ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ بھائی ڈر ہی گئے۔ کہنے لگا "یہاں ڈاکے بہت پڑتے ہیں۔ تمام قیمتی سامان کی انشورنس کروالیں۔"!"

وہ دونوں چپ ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد زری نے کہا۔

"پھر ضروری نہیں کہ اُس کی بات کو مذاق ہی سمجھا جائے۔ کیونکہ واقعی یہاں ڈاکے بہت پڑتے ہیں۔ اور شاید تم لوگوں کو علم نہ ہو لیکن تین ماہ پہلے ہمارے ہاں بھی ڈاکہ پڑا تھا۔"

"کیا؟" شہیر سب کچھ بھول بھال زری کی شکل تکنے لگی۔

"آپ لوگوں نے خبر بھی نہ دی۔" اُس نے شکوے بھرے انداز میں کہا۔

"ہاں!" زری پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔ "اُس کے بعد حالات نے اتنا مصروف کیا کہ ہوش ہی نہ رہا۔ اَب تو خیر بہت سنبھل گئے ہیں۔ کسی حد تک سب کچھ بھول بھی گئے ہیں۔ لیکن بہرحال! جو نقصان ہوا تھا۔ اُس کا ازالہ تو نہیں ہو سکتا۔"

ماحول ایکدم بوجھل ہو گیا۔

"شہیر! بات سُننا!" دوسرے کمرے سے اُسی لڑکے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سب چونکیں۔

"اچھا بھئی! اب ہم چلتے ہیں۔ تم بھی ضرور آنا۔ اَب تو تمہارے بھائی جی موجود ہیں۔ وہ رہ لیں گے گھر پہ۔ پھر باہر بھی لوٹ ہے۔"

وہ اُس سے وعدہ لے کر واپس آ گئیں۔

"خدا کے لیے نسرین! بس کرو۔ میں نے تمہیں نہیں بلایا۔ تم خود آئی ہو۔ اور بہتر یہ ہے کہ خود ہی چلی جاؤ۔"

"چلی جاؤں گی۔ فکر مت کرو۔ مگر میری باتوں پر سوچنا ضرور۔ دشمن نہیں ہوں تمہاری۔ تم نے تو اِدھر اُدھر کی اولادیں جمع کرنے کا ٹھیکہ لے کے سب سے کنارا کر لیا لیکن ہم تمہیں یوں پریشانیوں میں گھرا نہیں چھوڑ سکتے۔ آخر خون کا رشتہ ہے تم سے۔"

"یہ کیسا رشتہ ہے کہ تم جب آتی ہو۔ کوئی نہ کوئی دُکھ دے کر جاتی ہو۔"

"خدا نہ کرے جو میں تمہیں دُکھ دوں۔ میرا بات کرنے کا انداز ہی یہی ہے۔ لیکن بات ہے ہی اتنی کھری کہ میں بیٹھے بول سے بھی اسے چھپا نہیں سکوں گی۔ سارا خاندان جانتا ہے۔ باہر بھی کہیں کوشش کرو تو بات چھپائی نہیں جا سکے گی۔ اُلٹا بہت بڑا خطرہ مول لینے کے مترادف ہو گا یہ میری مانو تو ان کے مسئلے کو کسی نہ کسی طرح نمٹا کے اپنے بچوں کی فکر کرو۔"

"یہ بھی میرے ہی بچے ہیں۔ تم پتا نہیں کب سمجھو گی اس بات کو۔"

"ارے ہٹو بھی اب۔ اپنے ہوتے ناں تو تمہیں میری بات اتنی بُری نہ لگتی۔ اپنے بچوں کو کوئی نظروں

سے دور تھوڑا ہی کرنا چاہتا ہے؟ میری مان لو تمہارے دل میں بھی کہیں نہ کہیں وہی کھٹکا لگا ہے۔ جو دوسروں کے دل میں ہے۔ خود ہی سوچو۔ ماں باپ تو اللہ جانے کہاں ٹھکانے لگے۔ دولہا بھائی نے سہارا دیا۔ وہ گئے۔ اِن کی بہتری کے لیے برسوں کی کمائی نکلوائی، وہ لٹی۔ اب کس کی اتنی ہمت ہے کہ ان نحوست کی پوٹ کو۔"

"بس نسرین! اس سے پہلے کہ میری زبان سے بھی کوئی غلط بات نکل جائے، خاموش ہو جاؤ۔" شیریں کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ بُری طرح چیخ پڑیں۔

نسرین کے جانے کے بعد بھی کتنی ہی دیر تک ان کے الفاظ بھالے بن بن کر اُن کے دل میں اُترتے رہے۔ کتنا آسان ہوتا ہے دوسروں کے لیے مسائل کا حل پیش کر دینا۔ اور کتنا مشکل ہوتا ہے اُن پر عمل کرنا۔

وہ دیر تک اُسی طرح بیٹھی رہیں۔ اپنی بہن کی کڑوی باتوں پر غور کرتی رہیں۔ جب سے سحر پیدا ہوئی تھی۔ اُنہوں نے بار بار سحر کا ہاتھ اپنے بیٹے کے لیے مانگا تھا۔ اور جب شیریں کسی بھی قسم کی رسم کرنے سے معذوری ظاہر کرتیں تو وہ اسی طرح بھتے سے اُکھڑ جاتیں اُن کی ہر دلیل، ہر تاویل کو رد کر دیتیں۔ بے شک وہ سحر سے بہت پیار کرتی تھیں۔ مگر آشی اور زری کے لیے اُن کے دل میں کوئی بھی گنجائش نہ تھی۔ اور اب تو اُنہوں نے ایک انتہائی مہمل تجویز اُن کے سامنے رکھ دی تھی۔

"گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی۔" (ہونہہ! گھر گھر ہے گا تب ناں)

"یہ سب وقتی ہوتا ہے۔ منہ زبانی رشتے جوڑنے میں بہت وقت، بہت محنت صرف ہوتی ہے توڑنے میں سیکنڈ بھی نہیں لگتے۔ تم حوصلہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

(ہاں! حوصلہ کروں یہ ثابت کرنے کا کہ آج تک میں نے اور نصر نے اُنہیں جو کچھ سمجھایا، سب، غلط تھا۔ صرف میری بات ہوتی تو کر بھی لیتی۔ لیکن نصر کے لیے۔ ہرگز نہیں۔)

اُنہوں نے فیصلہ کر لیا۔

"میں اپنے بچوں کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی۔" مگر پھر۔ نشتر سے چبھنے لگے۔

"ارے ہٹو بھی، اپنے ہوتے تو تمہیں میری بات اتنی بُری نہ لگتی۔ تمہارے دل میں بھی وہی کھٹکا سا ہے۔ بھلا کس میں ہمت ہے کہ ان نحوست"

"نہیں!" وہ تڑپ اُٹھیں۔ "خدا کرے تم سے نسرین کیسی کیسی باتیں زبان سے نکالتی ہو۔ یہ کس مصیبت میں ڈال گئے ہیں نصر مجھے۔ خود تو منہ موڑ لیا اور میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ حالات سے لڑتے لڑتے تھکنے لگی ہوں۔ آپ ہوتے تو شاید میں منہ توڑ جواب دیتی ان باتوں کا۔ لیکن اب مجھ میں یہ حوصلہ نہیں کہ ساری دنیا سے کٹ کر رہ جاؤں۔ بہت کمزور کر دیا ہے مجھے وقت نے۔"

کھٹکے کی آواز نے اُنہیں چونکا دیا۔ آذر کچن کی طرف جا رہا تھا۔ ذوتین دنوں کے وقفے سے گھر آتا تو پھر سب سے پہلے اُسے کھانے ہی کی فکر پڑی ہوتی تھی۔

آذر کیا نظر آگیا۔ ذہن کی کیفیت عجیب سے عجیب تر ہوتی گئی۔ انسان کتنا ہی بے لوث بننا چاہے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ کھوٹ تو آ ہی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ انسان کیوں کہلاتا۔ فرشتہ قرار پاتا۔

"کیا کروں؟ کہہ دوں اِس سے؟ نہیں۔ بہت بُرا لگے گا اُسے۔ آزما کے تو دیکھوں؟ اتنی محبتوں کے بدلے کیا دے سکتا ہے وہ مجھے؟"

بس جیسے سودا سوار ہو گیا۔ شیریں کے دل میں خراج وصول کرنے کا۔ (وہ زمانا تو دانش سے کہوں گی کسی کو تو یہ کرنا ہی پڑے گا۔ وہ بھی زمانا تو زبردستی کروں گی۔ اُس کے ساتھ تو کر سکتی ہوں ناں) جو باتیں، جو فرق کبھی ذہن میں نہ آیا تھا، آج اُجاگر ہو رہا تھا۔

اس پر تو حق ہے پورا۔ لیکن پہلے آذر سے کہتی ہوں۔ کسی نہ کسی طرح یہ بوجھ بٹنا ہے، ورنہ یہ ذمہ داری کبھی پوری نہ ہو سکے گی۔ لوگ ہمیشہ یہی کہہ کر رد کرتے رہیں گے کہ شیریں خود کیوں نہیں اپنا لیتیں، اُن کے گھر میں بھی تو دو دو رشتے موجود

ہیں۔"
"آذر!" اُنہوں نے گھبرا کے آواز دے ڈالی۔ "کھانا کھا کے میرے کمرے میں آجانا۔ کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

وہ کتنی ہی دیر سے یونہی خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ سوچنا چاہتا تھا لیکن دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ ہر سوچ امی کے کہے ہوئے جملوں کے آگے بے بس ہو کر ختم ہو جاتی تھی۔ آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی تھی۔ "تم سوچ لو اچھی طرح۔ پھر جواب دے دینا۔"

وہ اُٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ باہر خشک ہوا چل رہی تھی۔ سامنے موجود شہتوت کے پتے آہستہ آہستہ جھڑتے جا رہے تھے۔ زمین پر زرد پتوں کی پازیب بچھی ہوئی تھی۔ پتا نہیں آسمان پر ان کا عکس پڑ رہا تھا یا موسم ہی ایسا ہو رہا تھا کہ ہر طرف زرد رنگ بکھرتے جا رہے تھے۔ ہواؤں میں، دیواروں پہ، درختوں پہ اور آذر کے احساسات پہ۔

"تم سوچ لو۔ پھر جواب دے دینا۔" جیسے ہر طرف سے آواز آ رہی تھی۔

اُسے تو اب معلوم ہوا تھا کہ آزمائش کیا ہوتی ہے؟ وہ سب کچھ جو اب تک گزرا، زندگی کا ایک عام سا رُخ تھا۔ اصل موڑ تو اب آیا تھا۔

سُولی اور صلیب میں کیا فرق ہوتا ہے، یہ اب پتا چلا تھا۔

انجام تو دونوں کا موت ہے۔

لیکن ایک میں فوری نجات اور دوسری میں لمحہ لمحہ قطرہ قطرہ سسک کر جسم میں اُترتی قضا۔

کاش! آپ نے پہلے سے کچھ تو اشارا دیا ہوتا۔ کبھی تو ایسی کوئی بات کہی ہوتی۔ اب۔ اب جبکہ ایک معزز اور معتبر رشتے سے رہتے ہوئے اتنے سال گزر گئے تو آپ نے مجھ سے کیا مانگ لیا۔ "تم سوچ لو۔ پھر جواب دے دینا۔"

میں کیا جواب دوں؟ میں کیسے وعدہ کروں؟ میں کس طرح خود کو سمجھاؤں؟

"ارے آذر! تم کب آئے؟" آشی تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے اُسے آذر ہی نظر آیا۔ وہ خوش ہو کر اُس کے کمرے میں ہی پہنچ گئی۔ لیکن پھر پریشان ہو گئی۔

"ایسے کیوں کھڑے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ تم جاؤ۔"

"کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

"نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم جاؤ۔"

"ہرگز نہیں۔ میں تو اُس وقت تک نہیں جاؤں گی۔ جب تک تم مجھے بتاؤ گے نہیں کہ۔"

"آشی پلیز۔ جاؤ یہاں سے۔" وہ زور سے چیخ پڑا۔ وہ گھبرا کے چپ ہو گئی۔

"میں جا رہا ہوں۔ امی سے کہنا ایک دو ہفتے ہوسٹل میں رہوں گا۔ تھیسس کا کچھ کام رہتا ہے۔" وہ کہتا ہوا تیزی سے نکل گیا۔

؎ یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاء جی کا نام نہ لو، کیا انشاء جی سودائی ہیں

کیسٹ پلیئر تو کافی دیر سے چل رہا تھا لیکن اس نظم نے اُس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔

وہ اپنے دوست قاسم کے کمرے میں بیٹھا تھیسس کے کچھ نکات لکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب ذہن میں یکسوئی ہی نہ تھی تو نکات کہاں سے آتے۔ پھر منتشر سوچوں میں اس نظم نے ایک نیا پتھر ڈال دیا۔

؎ وہ لڑکی اچھی لڑکی ہے تم نام نہ لو ہم جان گئے
وہ جس کے لانبے گیسو ہیں پہچان گئے، پہچان گئے

یہ کیا فضولیت ہے؟ یہ سب مجھے کیوں سنایا جا رہا ہے؟ میرا تو کسی لڑکی سے کوئی تعلق نہیں، کوئی لمبے بالوں والی حواسوں پر نہیں چھائی۔ میں ایسا دیوانہ نہیں ہوں، اپنی حیثیت، اپنا مقام اور اپنی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ پھر یہ۔

؎ ہاں ساتھ تمہارے انشاء جی اس گھر میں تھے مہمان گئے
پر اس سے تو کچھ بات نہ کی انجان رہے انجان گئے
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں

ہاں یہ سب بالکل جھوٹی باتیں ہیں۔ خوامخواہ ذہن میں آ رہی ہیں۔ کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ اُس لڑکی کی آنکھوں

نے بھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اگر کہا تھا تو میں نے ہرگز نہیں سُنا۔ اور اگر سُن لیا تھا تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ٹھیک ہے سمجھ میں آگیا تھا۔ لیکن کیا ہوا۔ میں خود کو سمجھا سکتا ہوں، یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

؎ جو ہم سے کہو، ہم کرتے ہیں کیا انشاء کو سمجھانا ہے
اُس لڑکی سے بھی کہہ لیں گے گو اب کچھ اور زمانا ہے

(خدارا! کیوں اس طرح رسوا کیا جا رہا ہے مجھے۔ کیوں شرمندہ کر رہے ہیں انشاء جی کسی کو اُس کی اپنی ہی نظروں میں۔ رہنے دیں پردہ۔ رہنے دیں اس خیال کو لاشعور کی دبیز گہرائیوں میں)

؎ یہ کیسا گورکھ دھندا ہے؟ یہ کیسا تانا بانا ہے؟
یہ باتیں جھوٹی!

(بس) اُس نے اُٹھ کر کیسٹ پلیئر آف کر دیا۔

"کیا ہوا؟" قاسم بیٹھا سر دھنے جا رہا تھا چونک پڑا۔

"کچھ نہیں۔" آذر کو ہوش آگیا۔ اُس نے پلیئر آن کر دیا اور خود نکل کھڑا ہوا۔

اُسے غصہ آ رہا تھا اپنی کمزوری پہ۔ اتنی اُلجھنوں میں گھرا ہوا تھا اور ایسی بے سر و پا باتیں ذہن میں آنے لگیں، قصور اُس کا بھی نہیں تھا۔ حقیقتوں کے رنگ اتنے پھیکے پڑ گئے تھے کہ فطرت گھبرانے لگی۔ زندگی میں چمک نہ رہی تو خوابوں کی کھڑکیاں خود بخود کھلنے لگیں۔ فضاؤں میں زردی گھلی تو سدا ہرے بھرے رہنے والے نیم کے درخت اپنی طرف بلانے لگے۔ مگر یہ تو بس ایک فرار تھا۔ اس طرح زندگی تھوڑی گزر سکتی تھی۔ حقیقت کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔ آج نہیں تو کل۔

عجیب حال تھا۔ آنکھیں کھولنا بھی مشکل کہ سچائی برداشت سے بڑھ کر بھیانک بنی اُس کے سامنے چلی آئی تھی۔ بند کرنا بھی مشکل کہ خواب خوش فہمیوں کا سہارا لیے اُسے ایسی دنیا میں لے جاتے تھے جہاں سے واپسی بہت دشوار ہوتی۔ اور وہ خود غرض نہیں کہلانا چاہتا تھا۔

"اوہ۔ یہ میں کس طرف آگیا۔"

اُس نے چونک کر دیکھا۔ کیمپس نظر آ رہا تھا۔

سحر نے ڈرتے ڈرتے اسکول کے احاطے میں قدم رکھا۔ آج تو ڈرائیور انکل نے حد کر دی تھی۔ آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ لیٹ کروا دیا تھا۔ اسمبلی ختم ہو چکی تھی۔ شاید پہلا پیریڈ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اُس کے ساتھ آنے والے مینا اور عادل بھی سہمے ہوئے تھے۔

"سحرش باجی! میڈم ناراض تو نہیں ہوں گی ناں!" کتنی معصومیت سے پوچھ رہے تھے عادل میاں۔ اُسے غصہ آنے لگا۔ دل چاہا کہہ دے ہاں، تمہارے ابو اتنا لیٹ پہنچائیں اور میڈم ناراض بھی نہ ہوں ابھی بادشاہت ہے، مگر ان بے چاروں کا کیا قصور تھا۔ والد صاحب کچھ تھے ہی لیٹ لطیف اور کچھ اُن کو اتنے الگ الگ اسکولوں میں بچوں کو ڈراپ کرنا ہوتا تھا کہ دیر ہو ہی جاتی تھی۔ ساری مصیبت وہ اپنے بچوں کے لیے ہی جائز سمجھتے تھے۔ چنانچہ باقی تو وقت پر پہنچ جاتے۔ لیکن سحر کے اسکول کی باری ہمیشہ آخر میں ہی آتی۔ وہ تو کبھی اُن کی وین میں نہ آتی مگر مجبوری تھی۔ یہ گھر اتنی دور تھا کہ وہاں سے اسکول کی کوئی بس آتی ہی نہ تھی۔ اور پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے پر اُسے کم از کم دو بسیں بدلنا پڑتیں۔ اب اس سال تو برداشت کرنا ہی تھا۔ پھر کالج میں دیکھا جاتا۔

"خیر، میڈم سے ڈانٹ تو پڑے گی ہی۔ کون سا نئی بات ہو گی۔" وہ تسلیاں دیتے دیتے آگے بڑھی تو ٹھوکر بھی لگ گئی۔ اتنا بڑا پتھر راستے میں پڑا تھا۔

"عجیب لاپروا لوگ ہیں۔" وہ پیر سہلاتے سہلاتے بڑبڑائی۔ پھر پتھر اُٹھا کے ایک کنارے پہ رکھا۔ اچانک اس نے کچھ عجیب سی بات محسوس کی، کنارے پہ اور بھی بہت سے پتھر پڑے تھے۔

اب جو نظریں اُٹھائیں تو پتا چلا کہ پورا گراؤنڈ پتھروں سے بھرا پڑا ہے۔ اور شاید یہی وہ واحد آؤٹ سائیڈر تھے جو اس وقت اسکول میں تھے۔ ورنہ باقی اسکول خالی تھا۔

اُسی وقت ایک اور پتھر اُس کے پاس آ کے گرا۔ اُسے ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ سنگ پھیلائے نہیں، برسائے گئے تھے۔

"ارے بیٹا! تم لوگ کدھر سے آ گئے؟" چوکیدار

دوسرے گیٹ سے بھاگم بھاگ اُن کے پاس آ رہا تھا۔

"اسکول تو بند کر دیا گیا ہے!"

"بند کر دیا گیا!" سحر نے حیرانی سے دوہرایا۔ "کیوں چاچا؟"

"ادھر مارکیٹ میں رات کو چھ بندے مارے گئے۔ تین تو تنظیم کے تھے۔ ان ہی کے لیے گولیاں آئی تھیں لیکن ساتھ ساتھ تین اور بھی مارے گئے، دو تو راہ گیر تھے۔ اور ایک وہ چاٹ والا۔ جو چھٹی کے وقت اسکول کے پاس کھڑا ہوتا تھا ناں!"

چوکیدار اُسے یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اُس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔

"وہ۔ وہ کیسے مر سکتا ہے؟ وہ تو اتنی اچھی مزے کی چاٹ بناتا ہے۔ اُس سے تو کوئی ناراض بھی نہیں ہو سکتا، وہ کیسے۔؟"

اُسی وقت ایک اور پتھر آیا۔

"یہ پتھراؤ صبح سات بجے سے ہو رہا ہے اسی لیے اسکول نہیں کھلا۔ اب تم لوگ گھر جاؤ۔" چوکیدار گیٹ کی طرف چل پڑا۔

مگر وہ گھر کیسے جاتے۔ وین تو جا چکی تھی۔ اُس نے آفس کی چابی لے کر گھر فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن پھر یاد آیا کہ فون تو کٹا ہوا ہے۔ اس مہینے اُس نے اور عنصر نے مل کر جو بجٹ بنایا تھا اُس میں فون کے بل کی گنجائش بن ہی نہ رہی تھی۔ اس لیے اُن دونوں نے ہونی کو ہو جانے دیا تھا۔ دانش اور آذر کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ بل جمع کراتے۔ اس لیے اُس کے اور عنصر کے عقلمندانہ فیصلوں پر دانت پیس کر صاد کہنے کے علاوہ گھر بھر کے لیے کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ اور اب سحر اپنی اسی کفایت شعاری کے ہاتھوں بُری طرح پھنس گئی تھی۔ اس شہر میں فون کے بغیر زندگی بہت دشوار تھی۔

عادل سے نمبر لے کر اُس نے ڈرائیور انکل کے دفتر فون کیا مگر وہ وہاں پہنچے ہی نہ تھے۔ ویسے بھی یہ کوئی باقاعدہ دفتر تو تھا نہیں۔ بس دوست کے ساتھ مل کر کوئی کمپنی سی کھول رکھی تھی انہوں نے۔ اللہ جانے کس چیز کی۔ ہو سکتا ہے کہیں اور کام سے نکل گئے ہوں بہر حال اُن کے دوست نے یقین دلایا کہ جیسے ہی وہ آئیں گے، پیغام دے دے گا۔ وہ صبر کر کے بیٹھ رہی۔

عادل اور مینا کے لیے یہ غیر متوقع چھٹی تھی۔ وہ خوشی سے چھلانگیں لگاتے پھر رہے تھے۔ اور سحر ایک طرف بیٹھی ہول رہی تھی۔ ایسا خوف تو اُس دن بھی نہ طاری ہوا تھا۔ جب اس کے گھر کا صفایا ہوا تھا۔ تب سب لوگ خصوصاً امی جو اُس کے پاس موجود تھیں۔ مگر آج تو جان نکلی جا رہی تھی۔

دس بجنے کو تھے۔ اس نے باہر جا کے دیکھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ اندر آئی اور پھر فون کیا۔ اب بھی وہی صورت تھی۔ وہی یقین دہانیاں، طفل تسلیاں تھیں۔ دوسرے لوگوں کو کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ کس آزمائش سے گزر رہی تھی۔ باقی شہر تو پُرسکون ہی تھا۔ بھائیوں سے بھی یہ اُمید نہ تھی کہ وہ اخبار پڑھنے کی زحمت کریں گے۔ لیکن پھر بھی شاید کر لیں۔ اُمید تو رکھنی چاہیے۔

یوں تو وہ پبلک ٹرانسپورٹ سے بھی جا سکتی تھی۔ لیکن مینا اور عادل کا کیا ہوتا؟ دونوں بہت کم عمر تھے۔ نہ دوڑ کر کراس کر پاتے۔ نہ بسیں بدل سکتے تھے۔

"کیا مصیبت ہے؟" وہ جھنجلائی۔

"اب شاید ساڑھے دس ہو گئے تھے۔ بے چین ہو کے اُس نے دروازے سے جھانکا۔ ایک موبائل کھڑی نظر آئی۔ وہ مزید خوفزدہ ہو گئی۔ اور پھر اندر چلی آئی۔

چوکیدار اُس کی پریشانی دیکھ رہا تھا۔

"تم چلی جاؤ بیٹا! ابھی تو راستہ صاف ہے بعد میں جب جنازے اُٹھنے کا وقت آئے گا تو مزید ہنگامہ بڑھ بھی سکتا ہے۔" اس بات نے تو اُسے بالکل ہی دہلا دیا۔ مزید انتظار ناممکن ہونے لگا۔

"مگر یہ دونوں بچے؟"

"میں ہوں ناں یہاں! ان کی فکر مت کرو۔ جاؤ۔" وہ جھنجلا کے کہتے ہوئے چلا گیا ــــ شاید وہ لڑکی کی ذمہ داری لینے سے ہچکچا رہا تھا۔

"واقعی!" اُس نے خود کو سمجھایا۔ "اصل مسئلہ تو میرا ہی ہے۔ انکل کو جب بھی خبر ملے گی آ جائیں گے

ضرور۔ یہ تھوڑی کہ اپنے بچوں کو یہاں چھوڑ دیں گے۔ لیکن میں اتنی دیر نہیں رُک سکتی۔ ابھی تو لوگ جمع نہیں ہوئے۔ بعد میں جانے کیا ہو۔ مجھے چلے جانا چاہیے!"

یہ محض اتفاق تھا کہ آج سحر پر یہ وقت آ گیا تھا۔ ورنہ اس شہر کے لوگوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ کئی علاقوں میں بیک وقت بہت سے لوگ سحر کی طرح امتحان سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ کئی لوگ پل صراط پر کھڑے یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ آگے بڑھنا مناسب ہو گا۔ یا پیچھے ہٹ جانا۔

وہ چپکے سے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ کن اکھیوں سے مینا اور عادل کو دیکھا۔ وہ اُسی طرح شور مچاتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

"بس تھوڑا سا حوصلہ کرنا پڑے گا۔ ذرا سا۔ نظر انداز کرنا پڑے گا۔ ایک دفعہ ان گلیوں سے نکل کر باہر وسیع و عریض مین روڈ تک پہنچ جاؤں۔ تو سب کچھ پھر ویسا ہی ہو جائے گا۔ زندگی رواں دواں ہو گی۔ نہ یہ ہولناک سناٹا ہو گا۔ نہ لحہ لحہ بڑھتا ہوا خوف۔

اُس نے ہلکے سے گیٹ کھولا۔

"پھر گھر پہنچ گئی تو ابا کے ساتھ مل کر انکل کو فون بھی کراؤں گی۔ مسئلہ حل ہو جائے گا!"

اُس نے قدم باہر نکالا۔ نکلنے ہی کو تھی کہ ایکدم شور تھم گیا۔

"سحرش باجی! آپ جا رہی ہیں؟"

"باجی! کیا ابو آ گئے؟"

دھت تیرے کی!

(کاش وہ بہری ہوتی)

مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔

پھر ایک ذری نے نصر کو پکار لیا تھا۔ پھر ایک آذر نے شیریں کو بس میں کر لیا تھا۔ اُسے مڑنا ہی پڑا۔

کچھ دیر پہلے کے کھلکھلاتے چہرے اب زرد پڑ چکے تھے۔ ساری بے فکری اس احساس کے ساتھ تھی کہ سحرش باجی یہیں ہیں پر۔

"نہیں چندا! میں کہیں نہیں جا رہی۔ میں تو دیکھ رہی تھی یونہی۔ ہم ساتھ ہی جائیں گے، اگر انکل کو زیادہ دیر لگی تو کسی نہ کسی طرح چل پڑیں گے خود سے۔ بس تمہیں یا ٹیکسی لے کے۔ ٹھیک!"

یہ برسوں کا سلسلہ تھا عمروں کا فاصلہ تھا۔ گیٹ تک پہنچنے والی، گھر میں سب سے چھوٹی، سب کی لاڈلی سحر تھی۔ اور پلٹ کر مینا اور عادل تک پہنچنے والی۔ پُر اعتماد، اسکول کی سینئر اسٹوڈنٹ سحرش نصر تھی۔ تب ہی وین کا جانا پہچانا ہارن سنائی دیا۔

"حقیقتاً یہ ایک نازک معاملہ ہے۔" سر مرتضیٰ نے پوری بات سن کر کہا۔

"تمہاری پوری زندگی اس ایک فیصلے پر انحصار کرتی ہے۔ اور بات اتنی عجیب ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تمہیں کیا مشورہ دوں!"

"ایک طرف تم بھی حق پہ ہو کہ تیئس سال سے قائم ایک مقدس بندھن کو توڑ کر نیا رشتہ کیسے باندھ لو۔ دوسری طرف تمہاری امی بھی کیا کریں کہ اُن کی ساری محنت، ساری ریاضتیں اس موڑ پہ آ کے معاشرے کے سامنے بے بس ہو جاتی ہیں۔

"اصل میں سارا مسئلہ ہمارا سسٹم ہے۔ یہ نہیں کہ ہم میں سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ آج مذاکرہ کروا لو۔ نوے فی صد لوگ بڑھ چڑھ کر اس نظام کے خلاف بولیں گے۔ لیکن عمل کا وقت آئے تو شاید دس لوگ بھی آگے نہ بڑھیں۔ جو اصول ہم پر بھی تلوار بن کر سوار رہتے ہیں۔ وہی دوسروں کے معاملے میں خود ہمارے ہاتھوں استعمال ہوتے ہیں۔"

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

"حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ کبھی کسی نے تم لوگوں کی خبر کیوں نہ لی؟ ایسا بھی کیا؟ کوئی تو آتا۔"

آذر احساسِ توہین سے فنا ہونے لگا۔ کتنے غیر اہم تھے ہم اپنے خاندان والوں کی نظروں میں۔

"ہاں! آذر! ایک صورت ہو سکتی ہے۔" وہ کہتے کہتے چونکے۔ "کیوں نہ تم اُس بستی میں جاؤ جس کے نواح میں یہ حادثہ ہوا تھا۔ شاید تمہیں کوئی سراغ مل جائے۔ شاید کوئی بعد میں آیا ہو۔"

آذر حیران رہ گیا۔ یہ بات کبھی پہلے ذہن میں

کیوں نہ آئی؟ پہلے ایسا وقت بھی تو نہ آیا تھا۔

"اگرچہ مشکل ہی ہے لیکن اُمید تو رکھو۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب ہمارا کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن کم از کم لوگوں کے سوالات کے جواب تو مل جائیں گے۔ اپنا بیک گراؤنڈ تو مل جائے گا۔"

آذر کے دل میں روشنی کی کرن سی جگمگائی۔ اُس نے اِسی کے بل پہ راستہ تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔

"امی! امی وہ آئی ہیں۔ ساتھ والی۔" سحر پھولے پھولے سانسوں کے ساتھ کمرے کے اندر آئی۔

"ہیں! وہ کہاں سے آگئیں؟" شیریں کام چھوڑ کے باہر لپکیں۔ شہیر اور اُس کی امی آرہی تھیں۔ شیریں اُنہیں اندر لے آئیں۔ زری اور آشی بھی وہیں آگئیں۔ وہ شکوہ کررہی تھیں۔

"مجھے بہت افسوس ہے آپ لوگوں نے ہمیں اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اپنی پریشانیوں میں شریک کر لیتے۔"

"کیا فائدہ ہوتا۔" شیریں آزردگی سے بولیں۔ "جو ہونا تھا ہوچکا۔"

"بے شک ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ لیکن دل کا بوجھ تو ہلکا کیا جاسکتا تھا۔ کوئی ایسی تدبیر تو سوچی جاسکتی تھی، جس سے آئندہ ایسی کسی صورت سے نمٹا جاسکے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کل کو اگر ہمارے۔"

"ایسا مت کہیے۔" شیریں نے لرز کے اُن کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا نہ کرے جو کوئی اُن لمحات سے گزرے۔ آپ تصور بھی نہیں کرسکتیں کہ وہ کیسا وقت تھا۔ تب تو بے چینی اور اضطراب ہی محسوس ہوتا رہا۔ لیکن اُس کے بعد میں لحہ لحہ خوف کی اذیت میں ہوں۔ جو چیز گئی، سو تو گئی۔ لیکن اب یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ پلٹ نہ آئیں۔ وہ پورا گھر اور اُس میں موجود ہر متنفس کو دیکھ گئے ہیں۔ مجھے بس یہ وہم رہتا ہے کہ اگر اُنہوں نے میرے بچوں کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا تو کیا ہوگا۔" اُن کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ "آپ نہیں سمجھ سکیں گی۔ کوئی بھی نہیں سمجھ سکے گا۔ میرے خوف کو۔"

شہیر کی امی اُنہیں دیکھ رہی تھیں۔

"کتنی بے خبر ہیں آپ!" اُنہوں نے جیسے سرگوشی کی۔ "میں نہیں سمجھوں گی؟ میں؟ جو برسوں سے عذاب مسلسل کا شکار ہوں۔ اگر میں نہ سمجھ سکی تو پھر کون سمجھے گا؟" اُن کی کیفیت ہذیانی ہوگئی۔ الفاظ بے ربط سے نکلنے لگے۔ شہیر نے یہ دیکھا تو گھبراگئی۔ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا آنٹی! اب ہم چلتے ہیں۔ پھر آئیں گے چلیے امی!" وہ ماں کو سہارا دے کر واپس لے جانے لگی۔

شیریں حیران تھیں۔ اچانک کیا ہوا انہیں؟ اُنہوں نے شہیر سے پوچھنا چاہا مگر اُس نے اشارے سے منع کردیا۔

"اُفوہ۔ تیئس سال پہلے ہم بھی تو یہاں مقرر ہوئے بھی صرف پانچ سال ہوئے ہیں۔ آپ ہی بتائیے اتنی پرانی بات کا مجھے کیا علم ہوسکتا ہے۔ اگر آپ پرانا ریکارڈ چیک کرانا ہی چاہتے ہیں تو پھر آپ کو تھوڑا صبر کرنا پڑے گا۔"

آذر طویل سانس لے کر رہ گیا۔ مزید انتظار! اور وہ بھی ایسی خبر کا جس کے ملنے کا بیس فیصد بھی یقین نہ تھا۔ وہ کب سے در در کی خاک چھان رہا تھا۔ کہنے کو یہ وہی علاقہ تھا جہاں اُس نے اپنی شناخت کھو دی تھی۔ لیکن اتنے سالوں میں اُس میں اتنی تبدیلیاں آچکی تھیں کہ اب نام کے علاوہ اس میں پہلے والی اور کوئی بات نہ رہی تھی۔ اور وہ آیا بھی تو کس طرح تھا۔ شیریں کو اعتماد میں لے کر آتا تو شاید وہ اُسے تھوڑی معلومات ہی دے دیتیں۔ اُسے تو صرف اتنا علم تھا کہ بستی کا نام سیدپور تھا۔ اُس میں صرف ایک ہسپتال یا شفاخانہ تھا۔ جہاں اُس کا علاج ہوا تھا بس۔

اور اب اس بستی کی جگہ باقاعدہ ایک قصبہ بن چکا تھا۔ کئی ڈسپنسریاں موجود تھیں، شروع میں تو اتنی بھاگ دوڑ میں لگا رہا کہ ان میں سے اُس کے مطلب کی ڈسپنسری کون سی ہے۔ پھر کافی تگ و دو کے بعد اُسے یہ معلوم ہوا کہ اس طرح کے حادثے کے زخمی اس بستی میں لائے ہی نہیں جاتے تھے۔ کچھ

آگے ایک قصبے میں موجود ہسپتال میں داخل کیے جاتے تھے۔ وہ ہسپتال یقیناً بہت پرانا تھا۔

پھر آذر وہاں پہنچا۔ تو وہاں کا موجود اسٹاف اس حادثے سے بالکل ہی ناآشنا نکلا۔ کسی کو علم ہی نہ تھا، تیئس سال پہلے کوئی ایسا واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ایک شخص نے تین بچوں کو گود لیا تھا۔ یوں ہونے کو تو آئے دن حادثے ہوتے رہتے تھے، اور اُن سب کے ریکارڈز بھی رکھے جاتے تھے۔ لیکن اتنا پرانا ریکارڈ ہسپتال والے اُسے صبر کی تلقین کرتے رہے۔ وہ عمل پیرا ہوتا رہا۔ اور نہ جانے کب تک ہوتا رہتا۔ لیکن پھر اُسے احساس ہوگیا کہ یہاں اصل مقصد تو ٹالنا ہے۔ اور اُس کے بعد اس کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ صبر کا پھل کڑوا محسوس ہونے لگا۔ تب اُس نے انتظامیہ سے حتمی طور پر بات کی۔

اُن لوگوں کا تو اب بھی یہی ارادہ تھا کہ اس بات کو یہیں پر رہنے دیا جائے۔ لیکن آذر کے لیے تو یہ زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اُن کا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا تو آخر اُن لوگوں نے ایک راستہ ڈھونڈ ہی نکالا۔ اُس زمانے کے ہاسپٹل انچارج اگرچہ ریٹائر ہوچکے تھے۔ لیکن بقید حیات تھے۔ ہسپتال والوں نے ایک آدمی آذر کے ساتھ کردیا اور اُسے اُن کے گھر کا راستہ سمجھا کر اپنی جان چھڑالی۔

اور اب وہ اُمید و بیم کی کیفیت میں اُس گھر کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

شیریں کو دو اُلجھنوں نے آگھیرا تھا۔ ایک تو آذر دو تین ہفتوں سے غائب تھا۔ دوسری طرف شہیر اور اُس کی امی کی اُلجھی ہوئی گفتگو، وہ چاہتی تھیں کہ اُن کے گھر جائیں۔ تفصیلاً بات سنیں۔ لیکن آذر کی پریشانی نے اُنہیں کسی کام کا نہ رکھا تھا وہ جانتی تھیں اُنہوں نے اس سے بہت مشکل سوال کیا تھا۔ لیکن وہ پابند تو نہ تھا۔ منع کردیتا۔ یہ کیا کہ بغیر بتائے اس طرح غائب ہوگیا۔ آشی نے اُنہیں آذر کا پیغام دے دیا تھا لیکن اتنے سے پیغام سے بھلا کیا تسلی ہوتی۔

آذر تو اُنہیں سب سے پیارا تھا۔ وہی تو تھا جس نے لمحے بھر میں اُنہیں اپنی ماں سمجھ لیا تھا۔ ورنہ زری بھی کچھ عرصے ہچکچائی تھی۔ آشی تو شروع میں نعمر کے سوا کسی کی گود میں آتی ہی نہ تھی۔ پتا نہیں کیوں۔ حالانکہ اتنی چھوٹی بچی تو عورت کی گود سے ہی مانوس ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ لڑکیاں باپ سے زیادہ اٹیچڈ ہوتی ہیں اور لڑکے ماں سے۔ یہ اُن کی محبت ہی تھی کہ جب دانش پیدا ہوا تو ہو بہو آذر کا عکس لگتا تھا۔ آذر ہر وقت اُن کی نظروں کے سامنے جو رہتا تھا۔

آج کل تو اُنہیں سب بھولے ہوئے تھے، صبح آذر کے انتظار سے شروع ہوتی۔ پھر پتا نہیں کب شام اُتر آتی۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ حتیٰ کہ شہیر کی امی خود ہی ایک دفعہ پھر اُن کے گھر آپہنچیں۔

آج اُن کے چہرے پر پہلے جیسی بے رونقی نہ تھی۔ خود کو خاصا سنبھال رکھا تھا اُنہوں نے۔

شیریں اُسی دن کی باتیں چھیڑنا چاہ رہی تھیں۔ لیکن اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"آج نہیں۔ یہ بات پھر کبھی بتاؤں گی۔ آج تو میں خوشیاں مانگنے آئی ہوں۔ اُداسی کے لمحات ہرگز یاد نہیں کروں گی۔" اُنہوں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے بات شروع کی۔

"اُس روز بھی آئی کسی اور ارادے سے تھی۔ لیکن ماضی میں اُلجھ کے رہ گئی۔ سوچتی ہوں کیا فائدہ اس طرح بے سکون رہنے کا۔ جو بچھڑ گیا۔ سو بچھڑ گیا۔ اب تو جو ہے اُس کے لیے جینا ہے۔"

شیریں کو اُن کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ لیکن خاموش تھیں۔ کچھ دیر بعد اُنہوں نے خود ہی مدعا بیان کردیا۔

"بات یہ ہے شیریں! کہ مجھے اور میرے بچوں کو آپ کے گھر کا ماحول بہت پسند ہے۔ میں چاہتی ہوں، دونوں گھرانوں میں رشتہ داری قائم ہو جائے مجھے آشی بہت پسند ہے۔"

چند لمحوں کے لیے شیریں ساکت رہ گئیں۔ لیکن پھر نارمل ہوگئیں۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ زری اور آشی کے حسن اور آذر کی قابلیت سے متاثر ہو کر یہ خواہش ظاہر کرچکے تھے۔ لیکن پھر اصلیت کا علم

ہوتے ہی کینچلی بدل لیتے تھے۔ اتنی دفعہ دھچکے لگ چکے تھے کہ اب خوش ہونے سے پہلے ہزار باتیں واضح کرنی پڑتی تھیں۔

"یہ واقعی آپ کی اپنی خواہش ہے؟" اُنہوں نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

"پہلے تو یہ بچوں کی خواہش تھی۔ اب میری بھی بن گئی ہے۔" اُنہوں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"اصل میں، میں اتنی بے نیاز رہی ہوں کہ یہ لوگ مجھ میں کبھی وہ اپنائیت محسوس نہ کر سکے۔ جو اُن کا حق تھا۔ وہ باتیں جو اولاد ماں سے کہتی ہے، میرے بچے ایک دوسرے سے کہہ دیتے ہیں۔ میں تو شاید اب بھی ہوش میں نہ آتی۔ اگر اتفاقاً میں نے شاہ زر اور شہیر کی باتیں نہ سن لی ہوتیں۔ پھر میں نے غور کیا، سوچا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اب بہت وقت گزر چکا۔ اب تو اولاد کے گھر بسانے کے دن قریب آ گئے۔ اب حال سے مستقبل کی طرف جانا ہے۔ نہ کہ ماضی کی طرف۔"

وہ کہتے کہتے رُکیں۔ شیریں مہر بہ لب تھیں۔ نہ جانے اُن کے چہرے پر کیسے تاثرات تھے کہ شہیر کی امی، کچھ کر رہ گئیں۔

"اوہ۔ شاید آپ لوگ اپنی قومیت سے ہٹ کر شادی بیاہ کے معاملات نہیں طے کرتے۔"

"نہیں آپ غلط سمجھیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" شیریں ایکدم بول پڑیں۔

(بات تو اتنی سنگین ہے کہ سمجھانا بھی مشکل اور سمجھنا بھی مشکل) اُنہوں نے کہا۔ "میں کچھ دنوں میں آؤں گی آپ کے پاس۔ (اور آزماؤں گی آپ کا ظرف)

"آپ منع تو نہیں کریں گی ناں؟" شہیر کی امی نے بڑی اُمیدوں سے پوچھا۔

"نہیں۔ (مگر شاید آپ منع کر دیں) مگر پہلے آپ پوری تفصیل سے آگاہ ہو جائیں پھر بات آگے بڑھے گی۔ اچھی طرح سوچ لیجیے گا۔"

"سوچنا ہمیں نہیں آپ کو ہے۔ ہم نے تو جو فیصلہ کرنا تھا، کر لیا۔"

(بہت لوگ کہتے ہیں۔ پھر بدل جاتے ہیں۔ پہلے میرے بیٹے نے بھی یہی تو کیا تھا۔ اب غائب ہے ہفتوں سے)

"خیر دیکھا جائے گا۔ چلیں ابھی تو کچن میں بیٹھتے ہیں۔"

"تو تم نصر شیخ کے بیٹے ہو۔" وہ اُسے سر سے پیر تک دیکھ رہے تھے۔

(ہاں! کہلاتا تو ہوں!) "جی!" اُس نے مختصراً کہا۔

"بڑی پیاری شے تھا وہ۔ اُس دوران دوستی ہو گئی پھر تو اکثر ملاقاتیں رہتیں۔ ٹور کے سلسلے میں جب بھی ادھر سے گزرتا ضرور مل کے جاتا تھا۔ کم از کم میں نے تو اپنی زندگی میں ایسا ہنس مکھ خوش باش انسان نہیں دیکھا۔ مسائل کو ہنس کر جھیل جانے والا۔ محبت کرنے والا۔ یا تو یہ حال تھا کہ ذمہ داری لینے کو تیار ہی نہیں۔ یا پھر لی تو ایسے نبھائی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔"

(کاش نہ نبھائی ہوتی۔ چھوڑ دیا ہوتا ہمیں ہمارے حال پہ) کیسے کیسے عجیب خیالات آ رہے تھے دل میں۔

"ویسے تم اپنے ماضی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو لڑکے؟"

"کیونکہ۔ (کیونکہ میں کھو گیا ہوں) کیونکہ لوگ۔ اصل میں، میں اپنا نہیں تینوں میں سے کسی کا بھی: کچھ تو ہو دوسروں کو بتانے کے لیے۔"

"ہاں یہ ٹھیک کہا تم نے۔ دوسروں کو عجیب عجیب فکریں ہوتی ہیں پوچھیں گے بچوں کی اور؟" کوئی اُن سے پوچھے آپ کو کیا جو بھی ہوں۔ ہمارا حال دیکھو۔ نہ ماضی کا اچار ڈالنا ہے؟"

وہ دیر تک سماج، زمانے اور معاشرے کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ اور آذر کا دامن ہاتھ میں تھامے چپ چاپ سنتا رہا۔

"اچھا ہاں!" وہ چونکے۔ "تمہیں یہ پتا کرنا ہے کہ بعد میں کوئی تم لوگوں کا پوچھنے آیا یا نہیں۔"

"جی!" آذر نے شکر کیا کہ وہ اصل موضوع پہ آئے۔

"آئے تو تھے کچھ لوگ!" اُنہوں نے ذہن پہ زور دے کر کہا۔

آذر ہمہ تن توجہ ہو گیا۔

"اور میں نے نصر کو بھی اطلاع پہنچا دی تھی۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر میں آذر کے آنے سے پہلے کچھ نہیں کرنا چاہتی۔" وہ تنگ آ کے بولیں۔

"آذر کا میں نے پتا کیا تھا امی!" دانش کہہ رہا تھا۔ "وہ شاید اپنی کلاس کے ساتھ نارتھ سائیڈ پر گئے ہوئے ہیں۔ آ جائیں گے ایک دو ہفتوں میں۔"

"مزید دو ہفتے؟" وہ پریشان ہو گئیں۔ "اتنا عرصہ پہلے تو کبھی گھر سے باہر نہیں رہا۔"

"اُفوہ امی! آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے وہ کوئی بچے ہیں۔ اب کیا وہ تھوڑی سی تفریح بھی نہیں کر سکتے؟"

(تم لوگ نہیں سمجھو گے) "چلو میں نے مان لیا۔ وہ تفریح کرنے گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ ہوا کہ گھر کے سارے معاملات اُس کی عدم موجودگی میں طے کر دیے جائیں۔ آخر وہ تم سب میں بڑا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے امی! لیکن 'لڑکے' کی چھٹیاں بھی تو ختم ہونے کو ہیں۔" عنصر نے بزرگوں کے انداز میں کہا۔ "کم از کم ہم دیکھ تو آئیں کہ وہ دیکھنے میں کیسا ہے۔"

دانش سے ہنسی چھپانا محال ہو گیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"یہ کام تو تم لوگوں کا ہے۔ تم دیکھ آؤ کس نے منع کیا ہے۔" امی کی طرف سے اوکے ہونے کی دیر تھی کہ عنصر چھلانگ مار کر اُٹھ بیٹھا۔

"چلیے بھائی صاحب!" اُس نے دانی کو بھی گھسیٹ لیا۔

"یار! وہ مس ہانگ کانگ بھی تو ہوں گی۔" دانش متذبذب ہوا۔ "اب کے کہیں پتھر نہ برسائیں۔"

"اُنہیں کس نے لفٹ کرانی ہے۔ ہم تو اپنے ہونے والے 'اُن' کو دیکھنے جا رہے ہیں۔" عنصر ترنگ میں بولا تو امی نے فوراً ٹوکا۔

"اتنی جلدی اندازوں کے محل مت تعمیر کرو عنصر! ابھی کچھ نہیں ہوا۔"

"سوری امی!" عنصر فوراً سیدھا ہو گیا۔ "چلیں بھی" وہ دانش کو زبردستی لے گیا۔

دروازہ بابر نے ہی کھولا۔ اُنہیں دیکھا تو خوشی سے چہکنے لگا۔

"شکر ہے آپ لوگ بھی ہمارے گھر آئے!"

اتنی پذیرائی پر دانش کی خاصی ہمت بڑھی۔

"اور تم تو جیسے ہر وقت ہمارے گھر میں رہتے ہو۔" اُس نے بابر کو ہلکی سی چپت لگائی۔

دل تو یہی چاہتا ہے مگر آپ لوگ بلاتے ہی نہیں۔" اُس نے معصومیت سے کہا۔ تو وہ ہنس پڑے۔

عین اُسی وقت شاہ زر بھی باہر آ گیا۔ "کون آیا ہے بابر؟"

"ہمارے پڑوسی ہیں بھائی! عنصر بھائی اور دانش بھائی۔" بابر تعارف کروا رہا تھا۔ لیکن شاہ زر کی نگاہیں تو جیسے عنصر پر جم کر رہ گئی تھیں۔

اُدھر عنصر صاحب کا بُرا حال تھا۔ اُلٹے پاؤں آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے دروازے کی طرف لپکے۔ اور پھر پلٹ کر بھاگ لیے۔

دانش ہکا بکا رہ گیا۔ "پتا نہیں اس کو کیا ہوا۔ معاف کیجیے گا شاہ زر صاحب، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" وہ بھی تیزی سے بھائی کے پیچھے پیچھے بھاگا۔

شاہ زر ہنوز اُسی کیفیت میں تھا۔ شہیر آئی تو اُسے یوں گوتم بدھ بنا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"کیا ہوا بھائی؟" اُس نے ہاتھ لہرایا تو وہ چونکا۔

"بابر! یہ دونوں کون تھے؟"

"کون؟ دانش اور عنصر؟" بابر نے پوچھا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بتایا تو تھا پڑوسی ہیں؟" بابر بھی پریشان تھا بھائی کے حال پہ۔

"اور اس کے علاوہ آپ کے ہونے والے سالے بھی ہیں۔" شہیر نے مزید اطلاع فراہم کی۔

"کیا؟ اُف!" وہ سر تھام کے بیٹھ گیا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟" شہیر کو تشویش ہونے لگی۔ "ابھی خود ہی تو اتنا اچھل رہے تھے شادی کرانے کو۔ اب کیا ہو گیا!"

"یا اللہ! اگر ایسے ہی چکر بازوں سے مستقبل جڑنے والا ہے تو بہتر ہے میں اپنا بیمہ کرا ہی لوں۔ جاؤ بابر دوڑ کے عنصر سے کہو، فارم لے کر آئے فوراً۔"

دبتا دبا تھا؟ تو تمہیں کیوں نہیں بتایا بابا نے؟ امی کو کیوں نہیں بتایا؟ کم از کم ہم ماضی کے اس تاریک غار سے تو نجات پا لیتے۔" آذر سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا تھا۔

"کچھ لوگ کیا؟ دو لوگ تھے۔ ایک خاتون اور دوسرا اُن کا وکیل۔"

"وکیل؟"

"ہاں۔ کینیڈا سے آئی تھیں وہ۔ میری ین نام تھا۔" وہ خاموش ہو کے کچھ سوچنے لگے۔

آذر کی بے چینی سوا ہونے لگی۔ اب جب وہ چاہتا تھا کہ وہ بولتے رہیں تو وہ بار بار چپ ہو جاتے تھے۔

وہ بڑے مزے کا جملہ کہا تھا اُنہوں نے انگریزی میں کچھ اس طرح سے تھا

MY HUSBAND HAD KIDNAPPED MY DAUGHTER (میرے شوہر نے میری بیٹی کو اغوا کر لیا تھا)

ایک طنزیہ سی ہنسی اُن کے لبوں تک آ گئی۔

"بھلا بتاؤ تو۔ اپنی بچی کو کوئی اغوا کرتا ہے۔ میں نے بہت سمجھایا کم از کم کڈنیپ کا لفظ نہ استعمال کرے لیکن وہ نہ مانی۔ ناراض ہونے لگی کہنے لگی کہ ضرور میں نے اس کے شوہر سے ملی بھگت کر رکھی ہے۔ سنو تو ذرا۔ میں نے اس بندے کو دیکھا تک نہیں۔ اور وہ کہہ رہی ہے ملی بھگت۔ ہونہہ! بے وقوف کہیں کی۔" وہ بڑبڑانے لگے۔

"تو کچھ پتا چل سکا کہ اصل بات تھی کیا؟" آذر نے انتہائی تحمل سے دریافت کیا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں پتا چلا۔ جب وہ تھوڑی ٹھنڈی پڑیں۔ اور میں نے بھی بحث چھوڑ دی تو اُنہوں نے پوری تفصیل مجھے بتا دی۔

"اصل میں اُس خاتون کی شادی کسی پاکستانی لڑکے سے ہوئی تھی۔ اچھی بھلی محبت کی شادی تھی۔ مذہب کے سلسلے میں طے پایا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں گے۔ رہنا کینیڈا میں ہی تھا۔ پھر یہ ہوا کہ پہلی ہی بیٹی پیدا ہو گئی۔ اور وہ بندہ ایکدم سے بدل گیا۔ کہاں تو شہریت کے لیے مرا جا رہا تھا۔ کہاں اُسے ماحول کی فکر پڑ گئی۔ بضد ہو گیا کہ پاکستان چلو۔ اب ظاہر ہے، یہ تو سراسر زیادتی تھی۔ وہ کیسے جاتی۔ آخر اُس کا وطن تھا کینیڈا۔" وہ اُداس ہو گئے۔

"پھر؟" آذر بول پڑا۔

"پھر کیا۔ اُن کے جھگڑے ہونے لگے، جب تک بچی دو سال کی ہوئی، نوبت طلاق تک جا پہنچی۔ اب سیدھی سی بات تھی۔ وہ خاتون بھی کینیڈا کی شہری تھی۔ بچی بھی وہیں کی پیدائش، عدالت بھی وہیں کی، "بچی ماں کے حوالے کر دی جائے" قانون نے کہہ دیا۔ بات ختم۔"

"بات ختم؟ تو پھر وہ خاتون یہاں کیوں آئیں؟" آذر حیران رہ گیا۔

"اُفوہ یار! ایک تو تم کو جلدی بہت ہے۔ بتا تو رہا ہوں۔ یاد تو کرنے دو۔ ابھی سے کون سی بات ختم؟" وہ جھنجھلا گئے۔ آذر چپکا ہو کے بیٹھ رہا۔

"عدالت نے تو بات ختم کر دی تھی۔ مگر اس بندے نے رپھڑ ڈال دیا۔ راتوں رات بیٹی کو لے کر چمپت ہو گیا۔

بے چاری اس کے پیچھے یہاں تک آئی۔ مہینے بھر آنکھ مچولی ہوئی۔ کبھی وہ کہیں بھاگ جاتا کبھی کہیں۔ آخر کار یہ تعاقب ختم ہوا۔ اور وہ بندہ اس حادثے کے ہاتھوں انجام کو پہنچ گیا۔ اِدھر یہ بیچاری ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہلکان ہو گئی، عرصے بعد اسے پتا چلا کہ یہ سب ہو گیا۔ تھوڑی مطمئن ہوئی۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر کسی نہ کسی طرح میرے پاس پہنچی۔ اور میرے پاس پہنچی تو پھر پھنس گئی۔" انہوں نے گہری سانس لی۔

"یار! میں ایسا ہوں نہیں۔ کام سے کام رکھتا ہوں۔ ضرورت سے زیادہ بکھیڑے تو پالتا ہی نہیں۔ شروع میں تو یہی دل چاہا تھا کہ مٹی ڈالوں قومی جذبات پہ۔ نصر کا پتا سمجھا کے اُسے بھی ذمہ داری سے آزاد کروں اور خود کو بھی۔ میں ایسا کر ہی ڈالتا۔ لیکن پھر پتا ہے کیا ہوا؟

وہ بندہ میرے آڑے آ گیا۔ وہ جسے میں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ یہ اِدھر منت کرتی، وہ اُدھر ہاتھ جوڑتا۔ یہ اِدھر آنسو بہاتی، وہ اُدھر رونے لگتا۔ میں عجیب مصیبت میں پڑا ہوا تھا۔ کبھی اِدھر دیکھوں کبھی اُدھر۔ اُسے ڈانٹا بھی کہ تمہیں ضرورت کیا تھی ایسی بے جوڑ شادی کرنے کی۔ اب بھگتو۔ مگر وہ گڑگڑائے۔ کہے کہ میری غلطیوں کی سزا میری بیٹی کو مت دینا۔ اُسے اہلِ مغرب کے حوالے مت کرنا۔ مذہب اور وطن سے دور مت بھیجنا۔ بس یار! پھر میں بھی جذبات میں آ گیا۔ اڑ گیا۔

پھر میں قانون کا احترام کرنے والا معزز شہری نہ رہا۔ صرف نمائندہ مشرق بن گیا۔ اتنے جھوٹ بولے۔ اتنی اداکاری کی۔ ایسی ہٹ دھرمی دکھائی کہ کیا بتاؤں۔ صاف مکر گیا۔ کہ ایسی کوئی بچی میں نے دیکھی بھی ہے۔ وہ جانتی تھی میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ ماں تھی ناں۔ کئی دنوں تک آتی رہی۔ یہاں کی عدالت سے بھی پروانہ حاصل کر لیا۔ لیکن میرے دل کی عدالت پورے درجے کی جانب دار تھی۔ کسی انصاف کسی اصول کو مان ہی نہ رہی تھی۔ پتا نہیں کیا کیا دلیلیں لے کر آتی۔ قانونی نکات سمجھاتی۔ میں چپ رہتا۔ آخر ہار گئی۔

جو ساری عدالتوں سے جیتی تھی۔ میری ضد سے ہار گئی۔ واپس چلی گئی۔

تب میں نے نصر کو فون کر کے ساری بات بتائی۔ وہ مجھ سے متفق تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔

"تم نے ماں بیٹی کو الگ کیا ہے، اور اب میں تمہیں حق بجانب ثابت کر دوں گا۔ آنٹی کی پرورش احسن طریقے سے کر کے اس کے باپ کی روح کو سکون پہنچاؤں گا۔" بے شک وہ مجرم تھا۔ غلطی اسی سے ہوئی تھی۔ اُسے یہ شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ مگر اتنی تکلیفوں اور ایسی موت کے بعد اُس کے گناہ کچھ تو دھل گئے ہوں گے، یہی سوچ کر ہم سب اُس کی طرف تھے۔

"وہ کینیڈین بالکل صحیح سمجھی تھی۔ ہم نے واقعی ملی بھگت کر رکھی تھی۔"

آذر کھڑا ہو گیا۔

"جا رہے ہو؟ کچھ ٹھنڈا۔ گرم؟"

"نہیں، اب تو واپس جانا ہے۔ کافی دنوں کا نکلا ہوا ہوں۔ اجازت دیں۔" وہ واپسی کے لیے مڑا۔

"آذر بیٹا!" اُس کے قدم رُک گئے۔

"بیٹا! نصر تو چلا گیا۔ میں بھی پرانا مریض ہوں۔ کون جانے کب سانس رُک جائے۔ اب تم لوگوں کی باری ہے ذمہ داری نبھانا۔"

جب سے عنصر کی قلعی کھلی تھی۔ سب اُس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے، زری کو ہر وقت یہ پریشانی لگی رہتی کہ جانے کتنے دشمن بنا لیے ہوں گے ابھی تک عنصر نے۔ آنٹی کو پکا یقین تھا کہ یہ جو آج کل اُس کی پرنسپل پھر تھوڑی ناراض سی رہنے لگی ہیں تو اس میں ضرور عنصر کے اس انشورنس والے معاملے کا ہی کوئی ہاتھ ہے۔ امی نے باقاعدہ وارننگ دے رکھی تھی کہ اگر عنصر نے پھر کسی کو ورغلانے کی کوشش کی۔ تو وہ اُس کا گھر سے نکلنا ہی بند کر دیں گی، عنصر بے چارہ کبھی بے بنیاد الزامات کی تردید کرتا، کبھی پابندیوں کے خلاف آواز بلند کرتا۔

آج بھی سحرہ رہ رہ کر افسوس ظاہر کر رہی تھی کہ اتنے دنوں میں عنصر کو صرف ایک کلائنٹ مل سکا وہ بھی گھر کا نکلا۔

"ایک نہیں۔ پہلا اور آخری کلائنٹ کہو۔" دانش نے تصحیح کی۔

"کیوں! آخری کیوں؟" عنصر تڑپ اُٹھا۔

"وہ اس لیے کہ تمہارے ایگزام سر پر آ پہنچے ہیں۔ اور اب تم نے صرف پڑھائی میں سر کھپانا ہے۔ اور اگر ذرا ادھر اُدھر کے کاموں میں تم نے سر گھسایا تو میں سر کے بل لٹکا دوں گا۔"

"واہ۔ واہ۔ کیا بامحاورہ گفتگو کرتے ہیں موصوف۔" عنصر نے دل کھول کے داد دی۔ "امی! انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ قسم سے ساری بات ٹکا کے بات طے بھی کر آئیں گے۔ اور وہ بے چارے چپ کے چپ ہی رہ جائیں گے۔"

"عنصر! یہ مذاق نہیں ہے۔" امی نے گھورا۔ تو وہ سر کھجا کے رہ گیا۔

"امی! آپ آخر کب جائیں گی۔ اب تو شاہ زر

بھائی بھی چلے گئے۔" سحر کو بہت بے چینی ہو رہی تھی۔

"ہاں امی! آپ اس طرح چپ بیٹھی رہیں گی تو کہیں وہ مایوس نہ ہو جائیں۔ آپ کم از کم ان سے دوستی تو بڑھائیں۔" دانش نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

(تمہیں یہ ڈر ہے کہ کہیں وہ مایوس نہ ہو جائیں۔ اور مجھے یہ ڈر ہے کہ پوری بات سننے کے بعد وہ مجھے مایوس نہ کر دیں)

دانش شاہ زر سے ملا تھا۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ یہ شخص اُس کے خاندان میں شامل ہو جائے۔ وہ جانتا تھا امی کیوں تذبذب کا شکار ہیں، لیکن اُسے ان لوگوں سے کسی کم ظرفی کی اُمید نہ تھی۔ اُس کی عمر نا اُمیدی کی عمر نہ تھی۔ بار بار توقعات وابستہ کرنے، بار بار خوشیوں کے خواب دیکھنے کی عمر تھی۔

شیریں اُن سب کے پیہم اصرار سے مجبور ہو گئیں۔ اور زری کو لے کر شبیر کے گھر جا پہنچیں۔ شبیر یہ سمجھی کہ شاید بات پکی کرنے آئی ہیں۔ وہ تو سیدھی مٹھائی کی دکان پر دوڑی جاتی۔ لیکن شیریں نے بمشکل اُسے باز رکھا۔

"آخر دیر کس بات کی ہے آنٹی؟ دیکھیں ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ بے شک شادی تین چار سال بعد کریں۔ لیکن "ہاں" تو کر دیں۔" وہ پٹر پٹر بولتی گئی۔

زری کے لیے مسکراہٹ چھپانا دشوار ہو گیا۔ واقعی اس لڑکی کو کچھ پتا نہیں ہوتا کس کے سامنے کیا کہنا ہے؟

"یہ بڑوں کے کرنے کی باتیں ہیں بیٹا!" شیریں نے نرمی سے سمجھایا۔ "تم امی کو تو بلاؤ۔"

"امی تو۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ پھر جلدی سے بولی۔ "امی تو شاہ زر بھائی سے فون پر بات کر رہی ہیں۔ آپ بیٹھیں۔ ابھی آجائیں گی۔" وہ انہیں اپنے ساتھ لے آئی۔

شیریں حیران ہونے لگیں۔ "اتنی لمبی بات؟ خیر مرضی اُن کی۔" وہ یونہی کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ اچانک سامنے دیوار پر لگی ایک تصویر پر اُن کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ وہ تھم سی گئیں۔

اُنہیں لگا کہ جیسے ابھی دل پسلیاں توڑ کے باہر نکل آئے گا۔ بات سلجھنے کے بجائے اُلجھ چکی تھی۔

وہ تو بوجھ کم کرنے آیا تھا۔ اُلٹا منوں بوجھ مزید لاد کر واپس جا رہا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا، وہ آیا ہی نہ ہوتا۔

پہلے ماں نے سوال کیا تھا۔ اب معاشرے نے سوال اُٹھا لیا تھا۔

وطن اور مذہب کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ ماضی کریدنے کی اچھی سزا ملی تھی۔ اور پھر اُس کا ماضی تو ابھی تک تاریک ہی تھا۔

وہ حیران تھا، یہ کیسی گھڑی آ پہنچی تھی؟ کیا ہر حال میں اُسے سر جھکانا ہی پڑے گا؟ کیا وہ رشتہ اتنا ہی غیر اہم تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو اتنے عرصے کیوں اُس کی پاسداری کی گئی؟ کیوں اُسے شروع سے یہ احساس نہیں دلایا گیا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا۔

وہ خالی خالی نظروں سے بس سے باہر تکتا رہا۔ بس اب اونچی نیچی وادیوں سے گزر رہی تھی، وہی راستہ تھا جہاں سے ڈرائیور نے اُلجھنا شروع کیا تھا۔

اُسے خود پر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ ایسا بھی کیا۔ دو ڈھائی سال کی عمر کے بچے کو کچھ تو یاد ہوتا ذہن کی پلیٹ یوں تو صاف نہ ہوتی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ غیر معمولی یادداشت کا حامل ہوتا۔

نیچے کھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس حادثے کی گواہ! سارے راز سینے میں چھپائے آج بھی ہمیشہ کی طرح خاموش تھیں۔ کاش یہ بول سکتیں! کاش اِن کی زبان ہوتی تو میں آج ایک ایک بات ان سے پوچھ لیتا۔ اپنے ذہن میں اُبھرنے والی تمام اُلجھنوں کو دُور کر لیتا۔ اُس نے یونہی بس کے اندر نگاہ ڈالی۔ ہر طرح کی پبلک موجود تھی۔ خوش پوش مہذب لوگ بھی اور پرلے درجے کے جاہل بھی۔ اُس کے نزدیک ترین جو شخصیت بیٹھی تھی، وہ ایک بڑے میاں تھے۔ بار بار اُس سے باتیں کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن آذر کے خیالات اُسے کسی اور طرف متوجہ ہونے کی

اجازت ہی نہ دے رہے تھے۔ تنگ آ کر اُنہوں نے اِدھر اُدھر تلاش کرنی شروع کر دی تھی۔

ایک دم بس کو زبردست جھٹکا لگا۔ وہ اپنے ہی زور میں آگے کی طرف گر گیا

"یہ۔ تصویر کس کی ہے؟"

شبیر اُن کے ساتھ آ کے کھڑی ہو گئی۔ "یہ میری باجی ہیں عنبر۔"

شیریں ساکت کھڑی رہ گئیں۔

"پتا نہیں ہیں کہنا چاہیے یا؟" شبیر نے گہری سانس لی۔

"بس ایک اُمید ہے جس کے بل پر ہم ہمیشہ اُنہیں ساتھ گنتے ہیں۔ WORDS WORTH کی "WE ARE SEVEN" کی طرح!" وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئی۔ "اسی لیے مجھے اُس دن غصہ آ گیا تھا۔" وہ کن اکھیوں سے زری کو دیکھ کر بولی۔

"اصل میں آنٹی! کوئی مر جائے ناں تو صبر آ جاتا ہے۔ لیکن۔ لاپتا ہو جائے تو نہ تو صبر آتا ہے نہ سکون ملتا ہے۔"

"ہوا کیا تھا اِن کے ساتھ؟" شیریں نے بے حد حوصلے سے دریافت کیا۔

"صحیح طرح تو پتا نہیں۔ میں خود بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ لیکن سُنا ہے کہ اُنہیں اغوا کر لیا گیا تھا۔ ڈاکوؤں نے تین لاکھ روپے تاوان مانگے تھے۔ امی ابو نے گھر بیچ دیا۔ رشتے داروں، دوستوں سے قرض لیا۔ کسی نہ کسی طرح رقم جمع کر لی۔ لیکن کوئی لینے ہی نہ آیا۔ نہ ہی باجی واپس ملیں۔"

وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ بار بار اپنی امی کے کمرے کی طرف بھی دیکھنے لگتی۔

"پھر؟"

"پھر خبر ملی کہ اُن لوگوں کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ مری کی طرف جاتے ہوئے پوری کار کھائیوں میں دفن ہو گئی۔" اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"پھر ابو نے تو صبر کر لیا۔ لیکن امی کو کسی صورت قرار نہیں آیا۔ پہلے راولپنڈی سے لاہور اور پھر لاہور سے اب یہاں۔ مستقل وہ بھٹکتی رہی ہیں۔ پتا نہیں کیوں انہیں یقین ہی نہیں آتا۔ آج بھی صبح سے اپنے کمرے میں قید ہیں۔"

اچانک زری چیخ پڑی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپایا اور تیزی سے باہر بھاگ گئی۔

پتا نہیں کس طرح بس رُک گئی۔ ورنہ آذر کو تو لگا تھا کہ ختم ہوا اب سفرِ زندگی، تمام مسافر ڈرائیور کو ڈانٹ رہے تھے۔

"انسانوں کی طرح نہیں چلا سکتے؟ اتنا خطرناک راستہ ہے۔"

"آ جاتے ہیں دو چار بوتلیں چڑھا کے خود کو صندی جٹ سمجھ لیتے ہیں اور بس کو گھوڑا۔"

"ابھی جو ٹکر ہو جاتی تو کتنی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتیں؟ تم نے گناہ اسکور کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟"

"اُفوہ! بس بھی کرو۔ اُس وین والے کو کچھ نہ کہنا مجھے ہی بُرا بھلا کہنا سارے۔" ڈرائیور جھنجلا کے بولا۔ بس اب نارمل رفتار سے چل رہی تھی۔

"یہ لوگ ہمیشہ سے ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ دنیا بدل گئی۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ لیکن بس کو قابو کرنا کسی نے نہ سیکھا۔ ہوائی جہاز چلانا سیکھ لیتے ہیں۔ بس چلانا کوئی نہیں سیکھتا۔" اُس کے ساتھ بیٹھے بڑے میاں بڑبڑا رہے تھے۔

ڈرائیور نے پلٹ کر اُنہیں گھورا۔ لیکن اُن پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

"بابا جی! کیا پہلی جنگِ عظیم کے وقت بھی بسیں ایسے ہی چلتی تھیں؟" اگلی سیٹ پر بیٹھے ایک لڑکے نے شرارت سے پوچھا۔ سب مسکرا پڑے۔ وہ خفا ہو گئے۔

"اتنا پرانا ماڈل نہیں ہے میرا۔ سمجھے۔"

"چلیں قیامِ پاکستان کے وقت کا ہی بتا دیں۔"

وہ باز نہ آیا۔

"اُس وقت کا بھی مجھے نہیں پتا۔ تب میں نے صرف تانگوں اور بیل گاڑیوں پر سفر کیا تھا۔ ہاں بیس پچیس سال پہلے کا پوچھو تو بتا سکتا ہوں۔ اُس وقت

بے شک یہی حال تھا۔" وہ ماضی کے آئینے میں نہ جانے کیا کیا اُداسیاں چھانتے پھر رہے تھے کہ شکل ایکدم رونے والی ہو گئی تھی۔

"اس وقت تو ہمارے گاؤں کے ایک زمیندار کا پورا کنبہ ان بسوں کی تیز رفتاری کی نذر ہو گیا تھا۔"

"بس کرو بابا! کم از کم اس بس میں تو ایسے واقعے نہ دہراؤ۔" ایک خاتون نے دہل کر اپنے بچے کو گود میں چھپا لیا۔ لیکن باقی لوگ بہت متجسس ہونے لگے۔ اس لیے بابا جی نے سلسلۂ گفتگو برقرار رکھا۔

"اتنے اچھے چوہدری صاحب تھے وہ۔ سبھوں کا خیال رکھنے والے۔"

"تو بابا! انہیں کیا شوق چڑھا تھا کہ پورا کنبہ لے کر سفر کرنا شروع کر دیا۔" کنڈیکٹر نے بیزار سے لہجے میں پوچھا۔

"ارے بھئی۔ دس سال پرانا زمین کا مقدمہ جیتا تھا انہوں نے۔ اسی خوشی میں سب کو لے کر مری کی طرف گئے تھے۔ واپسی میں یہ ہو گیا۔ خدا کی مرضی۔ خوب ساتھ نبھایا سب نے ایک دوسرے کا۔"

ماحول سوگوار سا ہو گیا۔ آذر کو چڑ ہونے لگی۔ پہلے وہ کم اُداس تھا جو اب یہ مل گئے تھے۔

"سارے گاؤں میں سوگ منایا گیا۔ اتنے بہت امیر بھی نہ تھے۔ لیکن اخلاق ایسا تھا کہ دوسرے گاؤں کے رہنے والے بھی گرویدہ تھے۔ پورے چھ سو لوگ شریک ہوئے تھے جنازوں میں۔ پوتے بے چارے کی تو لاش بھی نہ ملی اس کی غائبانہ پڑھائی گئی۔ وہ شاید کھائیوں میں گر گیا تھا۔"

آذر کی تمام تر حسیات بیدار ہو گئیں۔ مگر زبان پر جیسے تالے پڑ چکے تھے۔ پورے جسم میں عجیب سی لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔ وہ یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ہر بات جیسے اپنے آپ سچائی میں ڈھل کے اس کے دل میں اُتر رہی تھی۔ وہ حقیقت کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اور زندگی اس کے پہلو میں، نہ جانے کب سے نوحہ کناں تھی۔ درد کا احساس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

کچھ دیر کے لیے بس میں خاموشی چھا گئی۔ سب توبہ استغفار پڑھنے میں لگ گئے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد ویسے ہی چہل پہل سی ہو گئی۔ لوگ بھول بھال گئے۔ بابا جی بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھے کسی بندے سے گفتگو میں لگ گئے۔ آذر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ جب وہ ہر طرف سے رسم مسافرت نمٹا چکے تو اپنی سیٹ پر اونگھنے لگے۔

"بابا جی!" آذر نے آواز کی لرزش پر بمشکل قابو پایا اور دھیرے سے انہیں پکارا۔

"ہوں!" وہ ہڑبڑا کر اُٹھے۔

"وہ جو واقعہ آپ بتا رہے تھے۔ تیئس سال پہلے تو نہیں ہوا تھا؟"

"کون سا؟ وہ۔ چوہدری صاحب والا؟" انہوں نے ہلکی سی جماہی لے کے پوچھا۔

"جی!"

"ہاں۔ اتنا ہی وقت گزرا ہو گا۔"

آذر نے لب چبا ڈالے۔

"کوئی نہیں بچا تھا؟ کوئی بھی نہیں، بچا تھا؟ پورا خاندان مٹ گیا تھا؟" پتا نہیں کس طرح الفاظ اُس کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کا دل جملوں کی صورت میں کٹ کٹ کے باہر آ رہا ہو۔

"اُن کا خاندان تھا ہی بہت چھوٹا۔ اپنی بھی ایک ہی اولاد تھی۔ پھر بیٹے کی شادی کی تو تین سالوں کے بعد ہی یہ حادثہ ہو گیا۔ ایک ہی پوتا بھی تھا۔"

"تو پھر وصول کس نے کیا؟ میتوں کو؟"

"چوہدری صاحب کے بھتیجے نے لاشیں وصول کی تھیں۔ بھائی بہن تو تھے ناں اُن کے، آگے اپنا کنبہ چھوٹا تھا۔"

"وہ۔ جس کی لاش نہیں ملی۔ اُس کے مرنے کا کیسے پکا پتا چل گیا؟"

"اب اتنا مجھے نہیں پتا۔" وہ بیزار ہو کے بولے۔ عجیب ہم سفر ملا تھا۔ کہاں تو گونگا بنا بیٹھا تھا کہاں پوچھنے پہ آیا تو سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا۔

"نہ بھی پتا چلا ہو تو کون سا کسی نے کوئی تحقیقات کرائی تھیں۔ ظاہر ہے جسے وراثت مل رہی ہو اُس کو باولے کتے نے کاٹا تھا۔ کہ اصل وارث کو ڈھونڈتا پھرتا۔ ویسے بھی وہ کہاں سے بچ سکتا تھا؟ دو ڈھائی سال کا بچہ۔"

کہتے کہتے اُن کی نظر آذر کے چہرے پر جا پڑی

اور وہ پتھر سے بن کر رہ گئے۔ کتنی ہی دیر وہ اُس کو ایک ٹک دیکھتے رہے۔ آخر عینک کے شیشے دھندلانے لگے۔

آذر نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔

بابا جی بہت دیر چپ بیٹھے رہے۔ جیسے حالات و واقعات کا تجزیہ کر رہے ہوں پھر وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کرنے لگے۔

"اگر وہ واقعی زندہ رہا تھا۔ تو شکر ہے کہ یہ بات کسی کو پتا نہ چل سکی۔ جو یہ اطلاع آگے تک پہنچ جاتی تو اُس کا بچنا محال تھا۔ ہر طرف مگرمچھ تھے۔ ہمدرد تو کوئی بچا ہی نہ تھا۔ ماں یتیم، باپ اکلوتا، دادا دادی سب رشتے ختم تھے، جو باقی تھے وہ دشمن تھے۔ عام لوگوں کی اتنی ہمت کہاں کہ چوہدریوں کے معاملے میں بولیں۔ اور موقع بھی کسے ملتا۔ چپکے سے سارا کام ہوتا۔ وہ بے چارہ کیا دفاع کرتا۔

بہت سے لوگ تو کہتے تھے باقاعدہ منصوبے کے تحت حادثہ کرایا گیا تھا۔ اللہ جانے۔ مگر یہ باتیں گھروں کے اندر ہوتیں۔ اوپر سے سب چپ رہتے تھے۔"

انہوں نے پھر آذر کو دیکھا۔ "ایسی مشابہت تو چھوٹے چوہدری کی بھی نہ تھی اپنے والد سے۔ واقعی۔ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ اس نے نسل چلانی تھی۔ سو بچا لیا۔"

آذر کو معلوم نہیں تھا۔ لیکن اُس کا چہرہ بھیگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اُن ساتھیوں کا ماتم کر رہی تھیں۔ جو اُس سے بچھڑ گئے تھے۔ تیئس سال سے ایک سوگ اُس پر واجب چلا آ رہا تھا۔

کچھ دیر تک وہ دونوں چپ رہے۔ پھر بابا جی نے اُسے متوجہ کیا۔

"یہ بس اب جس اسٹاپ پر رکے گی ناں!" انہوں نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "اُس سے سیدھا آگے کافی دور چلے جاؤ تو۔ گاؤں آ جاتا ہے۔ تم آنا۔ ضرور آنا۔ سارے بزرگوں کی قبریں ہیں وہاں۔ گاؤں والے اکثر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ مگر تمہاری بات تو اور ہو گی۔ انہیں تمہارا انتظار بھی ہو گا پتا نہیں کب سے۔

مگر ایسے مت آنا!" ایکدم سے انہیں خیال آیا۔ "انتظام کے ساتھ آنا۔ پوری تیاری سے آؤ گے تو شاید اپنا حق واپس بھی لے سکو۔ اور اس طرح آ گئے خالی ہاتھ تو واپس جانا بھی مشکل ہو جائے گا۔ وہ چھوڑیں گے بھلا ایسا چلتا پھرتا ثبوت؟"

وہ دیر تک اُس سے حالات پوچھتے رہے تفصیل سے اُسے گزرے ہوئے کل اور گزرتے ہوئے آج کی کہانی سناتے رہے۔ بار بار گاؤں آنے کا کہتے پھر خود ہی خوفزدہ بھی ہو جاتے۔ آذر سنتا رہا اپنے گھر کی کہانی۔ اپنے خاندان کی داستان۔

بس رکی۔ اور وہ بابا جی کو خدا حافظ کہنے دروازے تک آ گیا۔ وہ دور تک ہاتھ ہلاتے رہے۔ وہ بھی دیکھتا رہا۔ جب تک وہ راستہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

"ضرور آؤں گا۔ فرائض ادا کرنے اور حقوق کا حساب لینے۔ مگر ابھی نہیں۔

ابھی تو مجھے حساب دینا ہے۔ کسی کے مہربان ہاتھوں کی محفوظ پناہ کا۔ کسی کی پھوار جیسی نرم محبتوں کا۔ کسی بے غرض کا جو میرے بچپن کا امین بن گیا۔ کسی کے اعتماد کا۔ ابھی تو مجھے بہت سے قرض اُتارنے ہیں۔ اُس کے بعد آؤں گا، اگر زندگی رہی تو۔"

وہ جان گیا تھا۔ ماضی میں کیا بھید تھا۔ شیریں اور نصر نے بچے گود نہیں لیے تھے۔

پوری نسلیں پروان چڑھائی تھیں۔

وہ اوندھے منہ بستر پہ پڑی تھی۔

عجیب مشکل تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کب سے خواہش تھی۔ لوگوں کو منہ توڑ جواب دینے کی۔ آج جب وہ سر اُٹھا کے اپنے خاندان کا نام بتا سکتی تھی تو آنکھیں بھر آئیں۔ اپنی کیفیت کا اُسے خود کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

"زرش!" دروازے سے شیریں کی آواز آئی۔ وہ ایک دم اُٹھ بیٹھی۔ شیریں اُس کے پاس آ گئیں۔

"امی!" وہ اُن سے لپٹ گئی۔ "میں کیا کروں؟"

"حد ہو گئی زرش! اتنی سی بات نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے۔ تم فخر کرو اپنی خوش نصیبی پہ۔ شکر کے سجدے

ادا کرو۔ اُس نے تمہیں ہر طرف سے محبتوں کی بوچھار میں بھگو دیا ہے۔ ایسی قسمت تو بہت کم لوگوں کی ہوتی ہے بیٹے! کتنے ہی بچے ماں باپ سے بچھڑتے ہیں اور پھر رُل کے رہ جاتے ہیں، تم پر تو ہمیشہ سے خدا کا خاص کرم رہا ہے۔"

"امی!" وہ رونا چاہتی نہیں تھی۔ مگر بار بار آنسو نکل پڑتے تھے۔

"تمہاری اصل ماں تو وہی ہے۔ میں تو صرف ایک وسیلہ تھی۔" اُن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"سوچو تو کہ آخر کس چیز نے تمہیں اُس دن کھائی میں گرنے سے بچا لیا؟ وہ کون سی آواز تھی جو نفر کو تم تک لے گئی؟ کیوں ہم اسی گھر میں آ کے بسے؟ یہ تمہاری ماں کی دُعائیں تھیں۔ جو بار بار خدا سے تمہیں مانگ رہی تھیں۔ مجھے فخر ہے کہ اس دُعا کی قبولیت کے لیے ہمیں منتخب کیا گیا۔ ورنہ تمہیں تو اپنے گھر تک لوٹنا ہی تھا کسی طرح بھی سہی۔"

اُنہوں نے ہاتھ پکڑ کے اُسے بستر سے اُٹھایا۔

"میں نے تمہیں رخصت تو کرنا ہی تھا ایک دن۔ اُس طرح نہیں تو اِس طرح سہی۔"

لکڑی کے کواڑ کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر اُس نے ٹین کے بنے کواڑ کو دھکیلا۔ اور اندر داخل ہو گیا۔ اُس گھر کی حدود میں جہاں بسنے والی محبتوں کی ڈور سے اُس کی ہر پرواز منسلک تھی۔ وہ کتنا ہی دور چلا جاتا۔ کتنی ہی بلند اُڑان لیتا۔ لوٹ کے تو اِسی آنگن میں آنا تھا۔

شیریں اُسی کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ اُس کی تصویر ہاتھ میں لیے کسی سوچ میں گم۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور اُن کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اُنہوں نے چونک کے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ہونٹ کپکپا کے رہ گئے۔

"امی!" وہ سر جھکائے اپنے دل پر زخم لگانے لگا۔ "آپ وہی کریں جو مناسب سمجھیں۔ مجھے آپ کے تمام فیصلے منظور ہیں۔ مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں کسی بات سے انکار نہیں کروں گا۔"

وہ خاموشی سے سنتی رہیں پھر اُس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

"ذرا میری طرف دیکھ کر کہو۔"

وہ چپ رہا۔

"آذر۔!" اُنہوں نے زبردستی اُس کا سر اُٹھایا۔

آذر نے بہت چاہا نظر ملا سکے۔ لیکن بات اُس کے اختیار میں نہ رہی تھی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑا۔ اُس بچے کی طرح جس نے زندگی میں پہلا دُکھ دیکھا ہو۔

شیریں بھی سسک پڑیں۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا! میں نے جلد بازی کی تھی۔ میں بھول گئی تھی کہ امتحان لینے کا اختیار صرف خدا کی ذات کو ہے۔ مجھے ہرگز نہیں۔ شکر ہے تم واپس آ گئے۔ ورنہ اگر اس بازی میں میں نے تمہیں ہار دیا ہوتا۔ تو شاید عمر بھر بے قرار رہتی۔ زری کی امی کی طرح۔"

"زری کی امی؟" آذر ٹھٹک کے اُنہیں دیکھنے لگا۔

اُسی وقت دانش اور عنصر کمرے میں داخل ہوئے۔ بالکل بھوت لگ رہے تھے۔ سر سے پیر تک چونے سے لتھڑے ہوئے۔ آذر کو دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔

"لیں بھئی۔ آ گئے مفرور مجرم۔ اور امی! یہ کیا ڈرامہ بازی ہو رہی ہے؟ ہمیں تو سوال۔ کر کر کے تنگ کر دیا۔ اور انہیں تھوڑا سا ڈانٹا بھی نہیں۔ چلیں اِدھر کونے میں کھڑے ہو جائیں۔"

"دانی! بدتمیزی نہیں۔"

"اُفوہ امی! آپ تو بہت جلدی رنگ بدلتی ہیں۔ پوچھا بھی نہیں ہوگا کہ کہاں تھے اتنے دنوں سے۔ میں بتاؤں نکمے بھائی کام سے بچ کے بھاگے تھے۔ ہو گیا ہوگا کشف کہ آشی آپی کی شادی آنے والی ہے۔ گھر کی مرمت کرنی پڑے گی۔ چلو بھاگ لو۔"

دانی ترنگ میں آ کے بولتا ہی چلا گیا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟" آذر نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"آپ کو تو کچھ خبر ہی نہیں ہے بھائی! یہاں آپ کے پیچھے کیا کیا ہو گیا؟ وہ اپنی مس ہانگ کانگ تو زبردست نشانہ باز نکلیں۔ ہماری پتنگوں پر تو ہمیشہ سے نیت خراب رکھتی تھیں۔ اب بہنوں پر بھی ہاتھ

صاف کر لیا۔" عنصر جوش میں آ کے بتانے لگا۔

"اور اگلا شکار شاید آپ ہی ہوں۔" دانش نے بھی ٹکڑا لگانا مناسب سمجھا۔

"مجال ہے؟ اُس سے پہلے ہم اُن کا نشانہ نہ لے لیں؟"

"ضرور لے لو۔ لیکن کوئی مورچہ تو ڈھنگ کا بنا لو پہلے۔ ابھی تو صرف ایک کمرے کی سفیدی کی ہے۔ وہ بھی ایسی کہ جیسے سیاہی پھیر کے رکھ دی ہو۔ اتنا نہیں خیال کہ اب اُس کمرے نے ہمارے ہاتھ ہی آ جانا ہے۔ آئیں بھائی! آپ کو دکھاؤں اس کے کارنامے۔"

دانش اُسے اشارا کرتا ہوا چل دیا۔ لیکن آذر کے قدم ابھی اتنے ہلکے نہ ہوئے تھے کہ وہ اُس کمرے تک پہنچ جاتا۔ جس کی کھڑکی سے نظر آنے والا منظر، خوابوں کی طرح سدا سرسبز رہتا تھا۔

ابھی تو اُس کا ذہن گتھیاں سلجھا رہا تھا۔

اتنے دنوں میں کیا کیا ہو گیا؟

کیا آزمائشیں پار لگ گئیں؟

کیا وقت اور حالات صرف اِس لیے ٹھہر گئے تھے کہ اُس کی زبان سے ایک جملہ سُن سکیں؟

یا؟

اُسے ماضی تلاش کرتے کرتے اتنی دیر لگ گئی کہ حال بدل گیا۔

وہ کچھ دیر سحر زدہ رہا۔

پھر وقت اور خود بخود سمجھ گیا۔

اور کچھ بھی نہیں

کچھ بھی تو نہیں

صرف، رُت بدل گئی۔

یہ تو ہونا ہی تھا۔ وقت سدا ایک سا تھوڑی رہتا ہے؟

آذر یہ سب نہ بھی کہتا۔ خاموش رہ جاتا۔ انکار کر دیتا۔ تو بھی موسم اپنا وقت پورا کر کے گزر جاتا۔

مگر اپنا حق لیے بغیر۔

پھر ایک پچھتاوا بار بار اُسے نوروز کے استقبال سے روکتا۔ سرگوشی کرتا۔

"سنو! کیا تم نے اُداس موسموں کا حق ادا کیا تھا؟"

آج وہ سر اُٹھا کے کہہ سکتا تھا۔ "ہاں۔ کیا تھا۔ حوصلے سے، ہمت سے، محنت سے اور۔ وفا سے۔"

یہی تو ہیں موسم خزاں کے تقاضے۔

آذر نے تو فرض نبھا دیا تھا۔ سحرش تو پلٹ آئی تھی۔ دانش نے مقابلہ کر لیا تھا۔ آشی نے تو ہنر سیکھ لیے تھے۔ زری نے سر جھکا دیا تھا۔ عنصر نے سبق سیکھ لیا تھا۔

لیکن بہت سے لوگ ایسا نہیں کر پاتے۔

اپنے گھر، اپنی ملکیت، اپنے وطن پہ آنے والے مشکل وقت کا حق ادا نہیں کر پاتے۔

اپنی ذمہ داری دوسروں پہ ڈال دیتے ہیں بزدلوں کی طرح منہ چھپا لیتے ہیں۔ روپے کی جگہ ڈالر رکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ذرا خطرہ محسوس ہو۔ ساری رقوم بینک سے گھر میں ٹرانسفر کر کے ڈاکوؤں کے لیے دعوت عام کر دیتے ہیں۔

کیا اس قسم کی روش اختیار کرنے کے بعد ہمیں موسم گل کی خوشیاں مانگنے کا کوئی حق رہ جاتا ہے؟

کھڑکی کے پٹ بڑی دیر سے ہوا کے بوجھ سے تھر تھرا رہے تھے۔ آخر کھل گئے۔

ایک دم سے چوکھٹ پہ منتظر خوشبو کا زبردست جھونکا اندر گھستا چلا آیا۔

باہر جنگلی گلاب کی بیلیں پھولوں سے لد گئی تھیں۔ ہر طرف اُن کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں نہ پہلی سی خنکی تھی نہ گرمی۔

سال بھر سے سوئی جڑیں یکایک جاگ اُٹھی تھیں۔ پتا نہیں کون کون سی قسموں کے پودے زمین سے سر نکال رہے تھے۔

شہتوت کے درخت سے زرد رنگ مٹ چکا تھا۔ اُس کی جگہ ایک نیا رنگ اُبھر رہا تھا۔

بہار کا رنگ۔

اس گھر میں یہی تو خاص بات تھی۔

ہر موسم کھل کے آتا تھا۔

خزائیں بھی جم کے آئیں

بہاروں سے پہلے!